عنایت اللہ

پرچم اُڑتا رہا

جذبۂ حریت پر مبنی سچی تاریخی داستانوں کا مجموعہ

مکتبہ داستان

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ..... پرچم اڑتا رہا
مصنف ..... عنایت اللہ
ناشر ..... گل فراز احمد
علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع ..... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت ..... مارچ 2009ء
قیمت ..... 170 روپے

☆.....ملنے کے پتے.....☆

علم وعرفان پبلشرز
40۔ اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور
فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز
غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

حکایت پبلشرز
26-پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔ 7356541 -7321896

فہرست

سُرنگ جو روضۂ مبارک کو لگائی گئی	لُوطیب	۷
سیّد کا سجیلا	طاس	۱۵
بالاکوٹ کے میدانِ جنگ میں	ڈاکٹر صادق حسین	۳۹
حسین ناگن	ابنِ صحرا	۵۳
خنجر جو دل میں اُتر گیا	ابرار علی سیّد	۶۹
پدمنی اور علاؤالدّین خلجی	لیفٹیننٹ کرنل مختار احمد گیلانی	۸۹
مرتے باپ کی بددُعا	مہدی حسن پراچہ	۹۷
مارکونی اور مادرِ وطن	زبیر اسد/محمد علی چوہان	۱۰۹
تیسرا آدمی	علی عباس	۱۲۷
انگریز، انسان اور گدھا	میجر شرف الدّین	۱۳۵
نُور عنایت خان	ارشد بیگ	۱۴۵
وہ تُرکوں کے خلاف نہ لڑے	ابنِ صحرا	۱۶۷
پرچم اُڑتا رہا	جان گڈوِن/خواجہ نذیر الدّین	۱۷۷
تُرکوں کی قید سے میرا فرار	میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) مرحوم	۱۸۵
جب ہم نے دہشت پسندوں کو پکڑا	میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) مرحوم	۲۰۱

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پیش لفظ

تاریخ کی یہ پندرہ کہانیاں افسانے نہیں۔ ہر کہانی حقیقی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

ان میں دو کہانیاں سید احمد شہید کی تحریکِ مجاہدین کے جہاد کی ہیں۔ "سیّد کا سجیلا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ مسلمانوں اور سکھوں کے ایک معرکے کی اور ایک مُجاہد کی غیر معمولی شجاعت کی ایمان افروز کہانی ہے۔ "بالاکوٹ کے میدانِ جنگ میں" بھی مسلمانوں اور سکھوں کے ایک اور، بلکہ آخری، معرکے کی روئیداد ہے۔ اس میں ایک تو بدر کے میدان کی روایت ملتی ہے، دوسرے اس میں ایمان فروشوں کی غدّاری بھی شامل ہے جو مجاہدین کی شکست اور سید احمد شہید کی شہادت کا باعث بنی۔ اس غدّاری کے نتائج اتنے دُور رس تھے کہ برِصغیر کے مسلمان انگریزوں کی غلامی میں جکڑے گئے۔

دو کہانیاں الجزائر کی جنگِ آزادی کی ہیں جو مسلمانوں نے دس سال فرانسیسی استبداد کے خلاف لڑی تھی۔ یہ دو چار کرداروں کی انفرادی کہانیاں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ الجزائر کے مسلمان کس جذبے سے لڑے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں تُرکی نے پاکستان کی بہت مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ تُرکی کی اُس وقت کی حکومت بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ پاکستان کے ساتھ تُرکی کی اس محبت کا ایک پس منظر ہے جس میں اسلام کا رشتہ کارفرما ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کی ہندوستانی فوج کے مسلمانوں نے عراق کے محاذ پر تُرکوں کے خلاف لڑنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے کی دو کہانیاں خاص طور پر اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔

"پرچم اُڑتا رہا" ترکوں کے جذبۂ حُبّ الوطنی کی بڑی ہی عجیب کہانی ہے۔ صرف دو ترکوں نے ایک پوری قوم کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ اُس وقت یہ دونوں ترک ترکی میں نہیں آسٹریلیا میں تھے۔ اُدھر یورپ میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ آسٹریلیا انگریزوں کے زیرِ نگیں تھا۔ اس ملک میں یہی دو ترک تھے۔ انہوں نے وہاں اپنا مورچہ بنا لیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ انہوں نے یہ جنگ کس طرح لڑی اور اس کا انجام کیا ہُوا؟ اس کہانی میں پڑھیے۔

دو کہانیاں پاکستان کے پہلے میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) مرحوم نے سُنائی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں وہ ترکوں کے جنگی قیدی بن گئے اور وہ قید سے فرار ہو آئے تھے۔ اس کہانی میں بھی دلچسپی کا مواد خاصا ہے اور اس میں جذبہ بھی ہے۔

متفرق کہانیاں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔

اگر آپ اپنے بچّوں کو ایسی کہانیاں پڑھانا چاہتے ہیں جن میں کہانیوں جیسی دلچسپی ہو اور جو بچّوں میں جذبہ بھی پیدا کریں تو انہیں یہ مجموعہ پڑھائیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

سُرنگ جو روضۂ مُبارک کو لگائی گئی

سُلطان صلاح الدّین ایوبی کے دَور کی کہانیوں "داستان ایمان فروشوں کی" میں آپ نے سُلطان نُورالدّین زنگی کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ نُورالدّین زنگی صلیبیوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اسی نے صلاح الدّین ایوبی کو اس راہ پر ڈالا تھا کہ صلیبیوں کو عالمِ اسلام سے نکال کر اسلام کو یورپ کے قلب تک پہنچانا ہے۔ نُورالدّین زنگی کا اپنا بھی یہی مشن رہا۔ اسے ناکام کرنے کے لئے صلیبیوں نے عالمِ اسلام میں سازشوں، تخریب کاری اور مُسلمانوں کی کردار کُشی کے دِل کش حربوں کا جال بچھا دیا تھا۔ اس کی تفصیلات "داستان ایمان فروشوں کی" میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ان سازشوں میں ایک بڑی ہی بھیانک تھی صلیبیوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا جسدِ مُبارک روضۂ مُبارک سے نکال لے جانے کی کوشش کی تھی جو نُورالدّین زنگی نے پکڑ لی۔

نُورالدّین زنگی کو سُلطانِ عادل نُورالدّین زنگی بھی کہا جاتا ہے۔ اسلام کا یہ عظیم پاسبان حشیشین (حسن بن صباح کے فدائی قاتلوں) کے ہاتھوں اس طرح شہید ہُوا تھا کہ اُسے کھانے میں زہر دے دیا گیا تھا۔ اس کے اثر سے زنگی کے گلے میں سوزش ہوتی جس کا علاج کوئی طبیب نہ کر سکا۔ چند دنوں میں ہی نُورالدّین زنگی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ سب اسے گلے کا کوئی مرض سمجھتے رہے۔ یہ انکشاف بہت بعد میں ہُوا تھا کہ اُسے صلیبیوں نے فدائیوں کے ہاتھوں زہر دلوا کر قتل

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرایا تھا۔ اسی لئے اُسے نُورالدین زنگی شہید کہا جاتا ہے۔ اس کا پُورا نام الملک العادل نُورالدین محمُود زنگی تھا۔ ۱۱۱۸ء میں پیدا ہُوا اور ۱۱۷۴ء میں وفات پائی۔

سُلطان زنگی کی وفات سے بارہ سال پہلے ۱۱۶۲ء (۵۵۵ ہجری) کا واقعہ ہے۔ سُلطان کو جب میدانِ جنگ سے کچھ دِنوں کی مہلت ملتی تھی تو وہ راتوں کو کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھا کرتا تھا اور تہجّد کی بھی پابندی کرتا تھا۔ ایک رات سُلطان زنگی تہجّد پڑھ کر سو گیا۔ اس سے پہلے وہ ایک وظیفہ پڑھتا رہا تھا۔ اُس نے خواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا۔ آپؐ کے دائیں اور بائیں دو آدمی کھڑے تھے جن کے چہروں کے رنگ سرخ و سپید تھے۔ وہ عرب کی سرزمین کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے چہرہ مُبارک پر اُداسی بھی تھی اور غصّے کا تاثر بھی تھا۔ آپؐ نے ان دو آدمیوں کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ آپ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اشارہ اتنا واضح تھا کہ سُلطان زنگی سمجھ گیا کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم فرما رہے ہیں کہ ان سرخ و سپید چہروں کو پہچان اور مجھے ان سے بچا

سُلطان زنگی کی آنکھ کھل گئی۔ جسم پسینے سے شرابور اور دل پر مقدّس سا خوف تھا۔ سُلطان نے ذہن پر زور دیا کہ یہ اشارہ کیا تھا۔ اُسے یہ تو یقین ہو گیا کہ یہ دو آدمی جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے دائیں بائیں کھڑے تھے، صلیبی تھے۔ اس سے سلطان زنگی نے یہ تعبیر اخذ کی کہ رسولِ اکرمؐ نے حکم دیا ہے کہ اسلام اور عالمِ اسلام کو کفّار سے بچا۔ یہی سُلطان کی زندگی کا مشن تھا۔ اس خواب نے اُس کی حوصلہ افزائی کر دی اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اگلی رات اُس نے پھر یہی خواب دیکھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم انہی دو آدمیوں کے درمیان کھڑے ہیں جن کے چہرے سرخ و سپید ہیں۔ اب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور زیادہ واضح اشارہ کر رہے تھے کہ مجھے ان سے بچا۔ سُلطان زنگی کی آنکھ کھلی تو دل پر خوف اور ذہن میں اُلجھن تھی۔ وہ سمجھا کہ کسی

طرف سے صلیبیوں کی نئی یلغار آ رہی ہے اور وہ گھر میں بیٹھا ہے۔ اُس نے ہر اُس طرف جاسوس دوڑا دیئے جدھر سے صلیبیوں کے حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

تیسری رات بھی اُس نے یہی خواب دیکھا تو اُس نے اپنے وزیر جمال الدّین مُوصلی کو بلایا اور اُسے یہ خواب سُنایا۔ جمال الدّین موصلی دانشمند انسان تھا۔ وہ گہری سوچ میں کھو گیا، پھر بولا کہ اشارہ معمولی نہیں۔ اسے محض خواب یا خیال نہیں کہا جا سکتا۔

"آپ یہ خواب کسی اور سے بیان نہ کریں" — وزیر نے مشورہ دیا — "اور فوری طور پر مدینہ منوّرہ کو روانہ ہونے کی تیاری کریں۔ روضۂ مُبارک کی زیارت سے شاید حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اشارہ پوری طرح واضح ہو جاتے"

سُلطان نُورالدّین زنگی مضطرب تھا۔ اس خواب کو نظر انداز کرنے کی اُس میں جرأت نہیں تھی۔ اُس نے رختِ سفر باندھا۔ بیشمار مال و دولت بغرضِ خیرات ساتھ لیا اور عازمِ مدینہ منوّرہ ہُوا۔ وزیر جمال الدّین مُوصلی کو اور بیس محافظوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ سولہ دنوں کی مسافت نے اُسے مدینہ منوّرہ پہنچا دیا۔ اُس نے شہر سے باہر وضو اور غُسل کیا تاکہ اس مقدّس شہر میں پاک جسم سے داخل ہو۔ روضۂ مبارک کی زیارت کی۔ عقیدت مندی کا یہ عالم کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ رو رو کر التجا کی — "یا رسول اللہ آپ کیوں اُداس ہیں؟ .... یا رسول اللہ مجھے اشارہ دیں کہ آپؐ کے چہرۂ مُبارک پر مسکراہٹ لانے کے لئے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں"

اسی عالم میں اُس نے نماز پڑھی۔ اتنے میں مسجد میں نمازی آ گئے۔ نماز کے بعد وزیر جمال الدّین مُوصلی نے اعلان کیا کہ نُورالدّین محمود زنگی سلطانِ شام روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لاتے ہیں اور اہلِ مدینہ کے لئے کچھ زرِ نقد لاتے ہیں۔ مدینہ منوّرہ کے تمام باشندوں کو مسجد کے باہر آنے کو کہا جاتے کہ ہر ایک کا حصّہ سُلطان اپنے ہاتھوں ہر ایک کو دے دیں۔

شہر کی آبادی آج کی طرح اتنی زیادہ نہیں تھی۔ شہر میں اعلان ہُوا اور لوگ آنے لگے۔ سُلطان زنگی ہر ایک کو کچھ رقم دیتے ہوتے اُس کے چہرے کو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

غور سے دیکھتا۔ اُسے کوئی چہرہ سرخ و سپید نظر نہیں آ رہا تھا۔ خواب والے دونوں چہرے اُس کے ذہن میں نقش ہو گئے تھے۔ تمام آدمی اپنا اپنا حصہ لے کر چلے گئے تو سُلطان زنگی نے معززینِ شہر سے پوچھا کہ کوئی رہ گیا ہے؟

"وہی رہ گئے ہوں گے جو کسی کام سے شہر سے باہر چلے گئے ہیں"۔۔۔ سُلطان کو جواب ملا۔۔۔ "دو آدمی ایسے ہیں جو اپنا حصہ لینے نہیں آتے کیونکہ وہ خود متموّل ہیں۔ اکثر خیرات دیتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیا وہ یہاں کے رہنے والے ہیں؟"۔۔۔ سُلطان نے پُوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ اُسے جواب ملا۔۔۔ "مغرب کے کسی ملک سے آتے ہیں۔ اپنے گھر میں عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ روضۂ مُبارک کی زیارت کے لئے آتے ہوتے ہیں۔"

سُلطان نُورالدین زنگی خود بھی دانشمند تھا اور اُس کی نگاہ بہت دُور تک دیکھ سکتی تھی۔ اسلام اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے اپنی روح میں بسا رکھا تھا اور یہی روشنی اُس کے آگے اندھیرے پردے چاک کر دیا کرتی تھی۔ اُس نے جب سُنا کہ یہ دو آدمی جو اُس کے سامنے نہیں آتے وہ مغرب سے آتے ہیں اور گھر میں عبادت کرتے ہیں تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ صلیبیوں اور یہودیوں کی سازشوں سے آگاہ تھا۔ اُس نے شک رفع کرنے کے لئے کہا کہ ان دونوں سے کہو کہ اپنا حصہ نہ لیں، یہاں آ تو جائیں۔ میں بھی ان کی طرح یہاں اجنبی ہُوں۔

ان دونوں کو مجبوراً آنا پڑا۔ سُلطان نُورالدین زنگی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ دونوں خواب والے چہرے تھے۔۔۔ سرخ و سپید۔۔۔ چہرے کا ہر ایک نقش وہی تھا اور وہی قدبُت تھے۔ یہ دونوں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں کھڑے تھے اور ان کے درمیان رسولِ خُدا اُداس نظر آتے تھے۔

"تم دونوں یہاں کیوں آتے ہو؟"۔۔۔ سُلطان نے پوچھا۔

"ہم دیارِ مغرب سے حج کے لئے آتے ہیں"۔۔۔ ایک نے جواب دیا

۔۔۔ "یہ سال روضۂ مُبارک کے مجاور بن کر گزاریں گے، پھر چلے جائیں گے۔"

سُلطان زنگی ان کے قریب چلا گیا اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔۔۔ "اگر تم سچ بتا دو کہ تم کون ہو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔"

دونوں اپنی بات پر نہ صرف قائم رہے بلکہ انہوں نے غصّے کا اظہار کیا کہ اُن پر شک کیا جا رہا ہے۔ سُلطان نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کہاں رہتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ حجرہ شریف (جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ مبارک دفن ہے) کے قریب رہتے ہیں۔ سُلطان زنگی نے اپنے محافظوں سے کہا کہ ان دونوں کو ان کے گھر لے چلو۔ دونوں نے بہت احتجاج کیا، بہت غُل بپا کیا لیکن شام کے سُلطان کو کوئی روک نہ سکا۔ ان کے گھر جا کر دیکھا۔ دو قرآنِ پاک پڑے تھے۔ چند مذہبی کتابیں تھیں جو علماءِ اسلام کی لکھی ہُوئی تھیں۔ تسبیحیں تھیں اور فرش پر ایک جگہ ایک چٹائی بچھی تھی جس پر مصلّٰی رکھا تھا۔ سُلطان کو وہاں کوئی مشکوک چیز نظر نہ آئی۔

سُلطان خاموش اور پریشان ہو گیا۔ تب لوگوں نے کہا کہ ان دونوں پر کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔ یہ دونوں خیرات کرنے والے سخی اور پارسا ہیں۔ روضۂ مبارک کی مجاوری کرتے اور ہر صبح جنّت البقیع کی زیارت کرتے ہیں۔ ہر کوئی ان کا احترام کرتا ہے۔ سُلطان زنگی نے بظاہر ایسا رویّہ اختیار کر لیا جیسے اُس کا شک رفع ہو گیا ہو اور اُسے افسوس ہو کہ اُس نے دو پارسا رُوحوں کی توہین کی ہے لیکن یہ سوال اُسے پریشان کئے ہُوئے تھا کہ تین بار اس نے ایک ہی خواب دیکھا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کے درمیان اُداس کھڑے دیکھا اور آپؐ کا اشارہ بڑا صاف تھا کہ مجھے ان سے بچاؤ۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ رسولِ خُدا نے ایک ناچیز بندے سے کیوں مدد مانگی ہے؟

یہ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایسے کئی تخریب کار صلیبی اور یہودی پکڑے بھی گئے تھے جو علماءِ اسلام اور اماموں کے بھیس میں اسلام کی ہی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ سُلطان فرش پر بچھی ہُوئی چٹائی پر چلنے پھرنے لگا۔ اس نے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جُوتے اُتار دیتے تھے۔ بظاہر بے مقصد ٹہلتے ٹہلتے وہ مصلّے پر جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ مصلّے کے نیچے فرش میں سختی نہیں بلکہ لچک سی ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا کہ یہ چٹائی اور مصلّی اٹھا دو۔

دونوں چیزیں ہٹا دی گئیں تو جہاں مصلّی تھا، وہاں لکڑی کا ایک تختہ رکھا تھا اور اس کے اِرد گرد کچی مٹی تھی جیسے یہاں سے جگہ کھودی گئی ہو۔ سُلطان زنگی نے اپنے ہاتھوں تختہ اُٹھایا۔ اس کے نیچے ایک گڑھا تھا جس کی تہہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرف کو گھُوم گیا تھا ـــــ یہ سُرنگ تھی۔

سُلطان زنگی نے ایک محافظ سے کہا کہ وہ سُرنگ کے اندر جا کر دیکھے کہ کس طرف اور کہاں تک جاتی ہے۔ محافظ کو رینگ کر اندر جانا پڑا۔ اُس نے باہر آ کر بتایا کہ سُرنگ کتنی لمبی ہے اور کس سمت کو جاتی ہے۔ سرنگ حجرہ مبارک کی سمت جاتی تھی جہاں رسولِ کریمؐ کا جسدِ مبارک دفن ہے اور سُرنگ کی لمبائی اتنی تھی کہ حجرہ مبارک تک پہنچنے والی تھی۔

سُلطان زنگی نے دونوں سے کہا کہ وہ اذیّت ناک تشدد سے بچیں اور بتا دیں کہ یہ سب کیا ہے۔ انہوں نے پس و پیش کی تو محافظوں نے سُلطان کے اشارے سے انہیں زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے لوگ بھی ان کی مار پٹائی کرنے لگے تھے۔ سلطان نے انہیں چھڑا کر کہا کہ انہیں مرنے نہیں دیا جائے گا اور وہ مسلسل اذیّت میں رہیں گے۔ اب جب کہ ان کی کارستانی ظاہر ہو چکی ہے تو وہ اپنی ہڈیاں تڑوانے سے بچیں۔

انہوں نے بتا دیا کہ وہ دونوں عیسائی ہیں اور یہ منصُوبہ عیسائیوں اور یہودیوں نے مل کر بنایا ہے کہ رسولِ خُدا کے جسدِ مبارک کو نکال کر اس کی سرِ عام توہین کی جائے اور مسلمانوں کو دکھایا جائے کہ دیکھو اپنا رسولؐ، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مختصر یہ کہ کفّار رسولِ خُدا کے جسدِ مبارک کو اپنے عزائم کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان دو آدمیوں کو پارسا مسلمان زائرین کے بھیس میں بے انداز مال و دولت دے کر مدینہ منوّرہ بھیجا تھا کہ لوگوں پر پارسائی، ریاضت اور روضہ مبارک کی مجاورت کا تاثر پیدا کریں

اور بے دریغ خیرات اور صدقہ دیتے رہیں اور کسی قریبی مکان میں رہ کر حجرہ مبارک تک سرنگ کھود کر پہنچیں اور جسدِ مبارک نکال کر لے آئیں۔

یہ دونوں سُرنگ کھودتے رہتے تھے اور سُرنگ کی مٹی رات کو قبرستان میں بکھیر آتے تھے۔ انہوں نے چمڑے کی وہ بڑی بڑی تھیلیاں بھی دکھائیں جن میں وہ مٹی بھر کر باہر لے جایا کرتے تھے۔ وہ کئی مہینوں سے آہستہ آہستہ سُرنگ کھود رہے تھے تاکہ ایک ہی بار مٹی زیادہ جمع نہ ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اتنے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ وہ سوچ میں پڑ گئے تھے کہ سُرنگ کو آخر تک پہنچائیں یا یہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ جب سُرنگ حجرہ مبارک کے اتنی قریب پہنچ گئی کہ صرف ایک دن کی کھدائی باقی تھی تو آسمان سیاہ گھٹاؤں میں چھپ گیا۔ بجلی کی چمک اور کڑک اتنی زیادہ تھی کہ زمین ہلتی تھی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ زلزلہ آیا ہے۔ رعد اور باد و باراں کا ایسا طوفان آیا جو اس خطّے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ دونوں رُک گئے اور سرنگ کو آگے نہ کھودا۔ اتنے میں سُلطان نُورالدّین زنگی رسولِ خُدا کے اشارے پر آن پہنچا۔

سُلطان نُورالدّین زنگی اس سعادت پر زار و قطار رویا اور حجرہ شریف کی دہلیز کو تادیر چُومتا رہا کہ رسولِ خُدا نے یہ عظیم نیکی اس کے ہاتھوں کرائی ہے۔ اُس نے ان دونوں صلیبیوں کو روضہ مبارک کی دہلیز پر ہلاک کرایا اور ان کی لاشیں شہر سے باہر پھینکوا دیں تاکہ انہیں کُتّے اور گِدھ کھا لیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کی لاشیں جلا دی گئی تھیں۔ اس کے بعد سلطان نے روضۂ مُبارک کے اِرد گرد اتنی گہری خندق کھدواتی جو حجرہ مبارک کی گہرائی سے بھی نیچے چلی گئی۔ اس خندق میں اُس نے بڑے بڑے پتھر ڈلواتے جو اہلِ مدینہ کندھوں پر اُٹھا کر لاتے تھے۔ پھر بے اندازہ سیسہ پگھلوایا اور تانبا منگوا کر انہیں پگھلایا اور خندق میں ڈال دیا جو بہہ کر پتھروں کے درمیان چلا گیا۔ اس سے خندق بھر گئی۔ اسے اُوپر سے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا گیا۔ پتھروں اور پگھلی ہوئی دھاتوں نے حجرہ مبارک کے گرد ایسی مضبُوط زمین دوز دیوار بنا دی جسے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کوئی ہتھیار کاٹ نہیں سکتا۔

بہت بعد کے دَور کے بادشاہوں نے روضہ مبارک کو موجودہ شکل دی۔ سُلطان نُورالدّین زنگی کی زمین دوز گول دیوار ابھی تک زمین کے نیچے موجود ہے۔ علامہ جمال الدّین محمد مطری (وفات ۷۴۱ھ) نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ انہوں نے یہ واقعہ فقیہہ علم الدین یعقوب بن ابی بکر سے جن کے والدِ محترم مسجد نبوی کی آتش زدگی میں جل کر وفات پا گئے تھے، سُنا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ دو صلیبی اُندلس سے آتے تھے۔

سیّد کا سجیلا

یکم دسمبر ۱۸۲۶ء کی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی سلطنتِ مغلیہ کا سورج بھی کا ڈوب چکا تھا۔ قلعے جو مغلوں نے تعمیر کیے تھے وہ اُن کے مقبروں کی طرح اُداس اور خاموش تھے۔ ان میں ایک قلعہ لاہور تھا جسے شاہی قلعہ کہتے ہیں۔ اب یہ قلعہ سکھوں کے قبضے میں تھا۔ اس کا قلعہ دار اُودھم سنگھ قلعے کے اندر روزمرہ معمول کے مطابق ٹہل رہا تھا۔ دو محافظ اُس کے ساتھ تھے۔ ایک سکھ دوڑتا آرہا تھا۔ محافظوں نے آگے ہو کر اُسے روک لیا کہ وہ قلعہ دار کی طرف کیوں دوڑا آرہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ قلعے کا قاصد ہے۔

"آنے دو اسے" — قلعہ دار اُودھم سنگھ نے حکم دیا — اِدھر آؤ تے.... کیوں آئے ہو؟"

"ایک مسلمان کو پکڑا ہے مہاراج!" — قاصد نے آکر کہا — "وہ کہتا ہے میں اسلامی فوج کا قاصد ہوں اور مہاراجہ کے لیے پیغام لایا ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر اُسے مہاراجہ کے سامنے نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔"

"اسلامی فوج؟" — اُودھم سنگھ نے اپنے آپ سے سوال کیا — "کون سی اسلامی فوج؟.... اوہ.... یہ پشاور کے پٹھان خوانین کا قاصد ہوگا" — اُس نے رعونت سے کہا — "اُن کے قاصد کو گرفتار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ صلح کا پیغام لایا ہوگا۔ ایسے کمزور لوگوں کے قاصد سے ڈر کیسا!... چلو میں آتا ہوں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ اُس جگہ پہنچا جہاں سکھ سپاہیوں نے ایک مسلمان کو گرفتار کر رکھا تھا۔ کم و بیش بیس سکھ تلواریں سونتے ایک جواں سال مسلمان کو گھیرے میں لیے ہُوئے تھے۔ قلعہ دار اُودھم سنگھ کو دیکھ کر انہوں نے گھیرا کھُلا کر دیا۔ اُودھم سنگھ نے دیکھا کہ بیس بائیس سال عمر کا ایک مسلمان جس کی رنگت گوری تھی، کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ اُس کی تلوار اُس کی نیام میں تھی۔ اُودھم سنگھ کے چہرے پر خفّت کا تاثر آ گیا۔ اُس نے جتھے دار کاہن سنگھ کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

"مہاراج!"— کاہن سنگھ نے قلعہ دار کی آنکھوں میں غصّہ اور سوال بھانپ کر کہا — "یہ مہاراجہ سے ملنا چاہتا ہے مگر اپنی تلوار ہمارے حوالے نہیں کرتا۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"— اُودھم سنگھ نے اس جواں سال مسلمان سے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟"

"میرا نام ہمّت خان ہے"— مسلمان نے جواب دیا — "میں اپنے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کا پیغام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام لے کر آیا ہوں۔"

"اوہ، سیّد احمد"— اُودھم سنگھ نے بے نیازی سے کہا جیسے سیّد احمد کو وہ کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ اُس نے کہا — "کیا وہ چند ایک آدمیوں کو ساتھ مِلا کر سالارِ اعلیٰ بن گیا ہے؟"

"وہ کچھ بھی ہے، میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام ان کا پیغام لایا ہوں"— ہمّت خان نے کہا اور اپنے گرد سکھوں کے گھیرے کو دیکھ کر بولا — "آپ کا کوئی حقیر آدمی بھی ہمارے ہاں آ جائے تو ہم اُس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کریں گے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"یہ قلعہ ہے نوجوان!"— اُودھم سنگھ نے کہا — "ہمارے کچھ قاعدے قانون ہیں۔ ہم تمہیں مہاراجہ سے ملوا دیں گے لیکن تمہیں اپنی تلوار ہمارے حوالے کرنی پڑے گی۔"

"کچھ قاعدے قانون ہمارے بھی ہیں"— ہمّت خان نے کہا — "ہمارا مذہب ہتھیار دشمن کے حوالے کرنے کو گناہ کہتا ہے۔ میں آپ

کے مہاراجہ کو قتل کرنے نہیں آیا۔ انہیں پیغام دینے آیا ہوں۔"

"کیا پیغام دوستی کا ہے؟"— اُودھم سنگھ نے پوچھا — "مسلمان اب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اس کا انحصار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جواب پر ہے"— ہمّت خان نے کہا — "لیکن مجھے زیادہ بات کرنے کا حکم نہیں۔ مجھے صرف پیغام دینا ہے۔"

"تم آج رات ہمارے مہمان ہو گے"— اُودھم سنگھ نے کہا — "کل تمہیں مہاراجہ کے سامنے لے جایا جائے گا"— اُس نے جتھے دار کاہن سنگھ سے کہا — "اسے مہمان خانے پہنچا دو اور خیال رکھو کہ اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ ہو۔ اس کی تلوار اس کے پاس رہے گی۔"

اُودھم سنگھ ہمّت خان کو مہمان خانے بھجوا کر رنجیت سنگھ کے پاس چلا گیا۔ اُس وقت رنجیت سنگھ کوئی سنجیدہ بات سننے اور سمجھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اُس کے سامنے شراب رکھی تھی اور تین چار درباری مے نوشی میں اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُودھم سنگھ کو دیکھ کر اُس نے بازو پھیلا کر کہا — "ہمارا قلعہ دار بھی آ گیا ہے۔"

اُودھم سنگھ بیٹھ گیا مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ اُس نے قہقہہ نہ لگایا۔

"مہاراج جی!"— اُس نے رنجیت سنگھ سے کہا — "کیا یہ سیّد احمد وہی ہے جس کا آپ نے اُس روز ذکر کیا تھا؟ آپ نے کہا تھا کہ سیّد احمد ہندوستان کا رہنے والا ہے اور اب قندھار سے پشاور پہنچا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ کوئی عالم نہیں جادوگر ہے۔ جدھر جاتا ہے وہاں کے مسلمان اُس کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اُس کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔"

"کیا یہ بات کرنے کا تمہیں یہی وقت ملا تھا اُودھم سنگھ؟"— مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا — "تم نے کوئی نئی بات تو نہیں سُن لی؟ ہم سیّد احمد کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اِس وقت اُس کا ذکر کریں۔"

"نئی بات یہ ہے مہاراج جی!"— اُودھم سنگھ نے کہا — "کہ اُس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کا قاصد کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ قاصد کہتا ہے کہ وہ اپنی تلوار سمیت آپ کے سامنے آئے گا۔"

"کیا تم مسلمانوں کی صرف ایک تلوار سے ڈرتے ہو؟" — مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا — "اُسے صبح دربار میں پیش کرنا۔ اُس سے تلوار نہ لینا .... اور دیکھو اُودھم سنگھ! سیّد احمد سے اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں جتنا تم سوچ رہے ہو۔"

✪

اُودھم سنگھ کی مزاجی کیفیت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اُٹھ کر چلا گیا اور مہمان خانے جا پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ ہمّت خان نماز پڑھ رہا ہے۔ اُودھم سنگھ اُسے دیکھتا رہا۔ ہمّت خان نے نماز ختم کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے پھر ہاتھ منہ پر پھیر کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُودھم سنگھ کو دیکھ کر وہ حیران سا ہُوا۔ اُودھم سنگھ بیٹھ گیا۔

"میں تمہارے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں" — اُودھم سنگھ نے کہا — "میں نے اُس کے متعلق کچھ باتیں سُنی ہیں۔"

"آپ کو مجھ سے یہ اُمید نہیں رکھنی چاہیئے کہ میں ہر وہ بات بتا دوں گا جو مجھے نہیں بتانی چاہیئے" — ہمّت خان نے کہا — "آپ نے میری عزت افزائی کی ہے لیکن میں آپ کو اپنا دوست نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ہماری فوج کتنی ہے، ہمارے ہتھیار کیسے ہیں اور ہمارا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے سالارِ اعلیٰ سیّد احمد کے متعلق بتا دوں گا کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔"

"میں یہی جاننا چاہتا ہوں" — اُودھم سنگھ نے کہا۔

"آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی" — ہمّت خان نے کہا — "یہ مذہب کا معاملہ ہے اور ہر کوئی اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ پھر بھی آپ جو کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ اُن کا نام سیّد احمد ہے۔ ہندوستان کے شہر بریلی کے رہنے والے ہیں۔ اللہ نے انہیں رُوح کی روشنی

دی ہے، اشارہ دیا ہے اور انہیں ایک منزل دکھائی ہے جو حق اور صداقت کی منزل ہے۔ سیّد احمد عالمِ دین ہیں لیکن وہ حجرے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والے اور منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کرنے والے عالم نہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ مسلمان کے لیے جہاد عبادت ہے۔ ہندوستان اسلامی ملک ہے۔ مسلمان بادشاہ اللہ کی راہ سے بھٹک گئے تو آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں اسلام کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور اس ملک پر سمندر پار سے آیا ہُوا فرنگی قابض ہوتا چلا جا رہا ہے....

"سیّد احمد نے ہمیں سبق دیا ہے کہ قرآن کی رُو سے مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا کیونکہ غلامی میں اسلام کی رُوح مرجاتی ہے۔ سیّد احمد ہندوستان میں اللہ کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ملک کے حالات ایسے ہیں کہ جہاد لازمی ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ صرف جہاد کا سبق دیتے ہیں۔ کفّار کو وہ حق کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پر انسان کا قانون نہیں اللہ کا قانون چلے گا۔ ہمارے سالارِ اعلیٰ وہی کہتے ہیں جو قرآن میں لکھا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں، نگر نگر گھوم آئے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا پیغام دیتے اور انہیں اللہ کا راستہ دکھاتے ہیں۔ انہیں کہتے ہیں کہ کُفر کے خلاف جنگ ایک عبادت ہے اور اللہ کی راہ میں تیغ زنی کے بغیر دین کا علم مکمّل نہیں ہو سکتا....

"وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے مسلمان اُن کے مرید ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آواز میں ایسا جادو ہے کہ کوئی مسلمان اُن کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا۔ اُن کی زبان میں خدا کی آواز ہے۔ بے شمار غیر مسلم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں.... میں عالم نہیں حقیر انسان ہوں۔ میں اُن کی طرح بات نہیں کر سکتا اس لیے آپ کو میری زبان میں وہ جادو نظر نہیں آئے گا میری زبان میں وہ اثر نہیں۔ آپ کبھی اُن کی زبان سُنیں تو آپ کہیں گے کہ یہ انسان نہیں خدا بول رہا ہے، پھر آپ بھی میری طرح تیروں کی بارش میں بھی اور دشمن کی تلواروں کے سائے میں بھی نماز پڑھنے کی خواہش کریں گے۔ اگر آپ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جُھ سے پوچھیں گے کہ ہمارے لڑنے کا طریقہ کیا ہے تو میں صرف یہ جواب دوں گا کہ ہم اللہ کے بھروسے پر لڑتے ہیں۔"

سکھ کوئی قوم نہیں تھی۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کی تاریخ میں حکمرانی اور جنگ وجدل کا نام ونشان نہیں ملتا تھا اس لیے وہ فنِ حرب وضرب سے عاری تھے۔ البتہ لڑنا جانتے تھے کیونکہ اُن کا پیشہ ڈاکہ زنی اور رہزنی تھا۔ یہ جرائم وہ گروہوں کی صورت میں کرتے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی کیفیت دِگرگوں تھی۔ انگریز پاؤں جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوئی حکومت نہیں تھی۔ اس افراتفری سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اُن کا دورِ حکومت جبر کی طوالت صرف چالیس سال تھی، انگریزوں اور مسلمانوں سے لڑائیاں لڑتے گذر گیا۔ مسلمانوں کو سیّد احمد شہید نے تحریکِ مجاہدین کے پلیٹ فارم پر متحد کیا تھا۔

سکھوں میں اگرچہ فہم وفراست کی کمی اور خودسری اور سرکشی زیادہ تھی لیکن لاہور قلعے کا کمانڈر اُودھم سنگھ سنجیدہ ذہن کا آدمی تھا۔ وہ سوچنا سمجھنا جانتا تھا۔ اُس نے سیّد احمد شہید کے مقاصد سے اُن کے نظریات سُنے تو وہ اُن کا مذاق اُڑانے کی بجائے خاموشی سے مہمان خانے سے نکلا۔ اُس کا جُھکا ہُوا سر اور چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں کھویا ہُوا ہے۔

✪

اگلی صبح مہاراجہ رنجیت سنگھ شاہانہ تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ تخت کسی مسلمان بادشاہ کی یادگار تھا۔ رنجیت سنگھ کے چہرے پر فرعونیت تھی۔ اُس کا دربار اُن روایتی بادشاہوں جیسا تھا جن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ رنجیت سنگھ کے سامنے بیٹھے ہوئے درباریوں، پیچھے کھڑے محافظوں اور رانی پر سناٹا طاری تھا کیونکہ مہاراجہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ خشمگیں ہے۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

ہمت خان دربار میں داخل ہُوا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو سکھ لمبی برچھیاں اٹھائے آ رہے تھے۔ ہمت خان رنجیت سنگھ کے سامنے

جا رُکا اور بولا — "السلام علیکم" — مہاراجہ نے سر کو جھٹکا دے کر درباریوں اور محافظوں پر نظریں دوڑائیں اور گرج کر پوچھا — "اسے کسی نے بتایا نہیں کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار ہے جہاں آنے والا جُھک کر سلام کرتا ہے؟"

"مہاراجہ!" — ہمت خان نے کہا — "کوئی مجھے بتاتا تو بھی میں، جُھک کر سلام نہ کرتا۔ میں یہی پیغام لے کر آیا ہوں کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان کو اپنے سامنے جُھکاتے۔ اللہ کے بندے صرف اللہ کے سامنے جُھکا کرتے ہیں۔"

"میں وہ پیغام جو تم سیّد احمد کا لائے ہو سُن کر تمہاری قسمت کا فیصلہ کروں گا۔" مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا — "کیا تمہیں یہاں بھیجنے والے نے بتایا نہیں کہ رنجیت سنگھ کے دربار کے نام سے انگریز اور پٹھان کانپتے ہیں؟ تم کمسن ہو۔ تم میں جوانی کی نادانی اور جوش ہے" — اُس نے گرج کر کہا — "پیغام کیا ہے؟"

ہمت خان نے گول کیا ہُوا کاغذ کھولا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا:

"خدا کے حقیر بندے سیّد احمد کا پیغام، پنجاب کے حاکم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام.... میں تمہارے سامنے تین صورتیں رکھتا ہوں۔ پہلی یہ کہ اسلام قبول کر لو، پھر تم ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو گے لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔ دوسری صورت یہ کہ اسلام قبول نہ کرو۔ ہماری اطاعت قبول کر لو اور جزیہ ادا کرتے رہو۔ اس صورت میں تمہارے جان ومال کی حفاظت ایسے ہی کریں گے جیسے ہم اپنے جان ومال کی کرتے ہیں اور تیسری صورت یہ کہ اگر تمہیں یہ دونوں صورتیں منظور نہ ہوں تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور سن لو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان کا ہر ایک مسلمان ہمارے ساتھ ہے۔ تمہیں شراب سے اتنی محبت نہیں جتنی ہمیں شہادت سے ہے.... سیّد احمد۔ سالارِ اعلیٰ، لشکرِ مجاہدین۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مہاراجہ رنجیت سنگھ ہُنکارنے لگا۔ محافظوں کے ہاتھ کرپانوں کے دستوں پر چلے گئے۔ درباری اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ہمت خان جس کے چہرے پر سلیقے سے تراشی ہوئی چھوٹی داڑھی تھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے رنجیت سنگھ کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں بڑی آہستہ آہستہ تمام دربار میں گھومنے لگیں۔ وہ ہر سکھ کا چہرہ اور ہاتھ کرپان کے دستے پر دیکھتا گیا۔ درباری حکم کے انتظار میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک سکھ تھا جس کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس منظر کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ قلعہ دار اُودھم سنگھ تھا۔

"یہ لڑکا بڑی دُور سے آیا ہے"۔۔۔ رنجیت سنگھ نے کہا ۔"میں اس کی ماں پر رحم کرتا ہوں۔ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کا سر، داڑھی اور مونچھیں بال بال مونڈھ کر اسے لاہور سے نکال دیا جائے۔"

کاہن سنگھ جتھے دار نے ہمت خان کے عقب سے جھپٹا مارا اور اُس کی تلوار میان سے کھینچ لی۔ پانچ چھ محافظوں نے ہمت خان کو گھیرے میں لے لیا اور اُسے دھکیلتے ہوئے دربار سے لے گئے۔

"سیّد احمد"۔۔۔ رنجیت سنگھ نے طنزیہ کہا ۔"سیّد احمد .... یہ ملیچھ مُسلے برباد ہو گئے ہیں مگر ابھی تک اِن کے دماغ سے ہندوستان کی بادشاہی نہیں نکلی۔ مولویوں کی طرح وعظ کرنے والا سیّد احمد خالصہ راج سے ٹکر لینے آیا ہے۔ اُسے کسی نے بتایا نہیں کہ اب راج کرے گا خالصہ!"

"مہاراج!"۔۔۔ اُودھم سنگھ نے کہا ۔"بغیر دیکھے، بغیر جانے دشمن کو کمزور نہ سمجھیں۔ قاصد نوشہرہ سے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر نوشہرہ تک آ گیا ہے۔ سیّد احمد نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہو کہ تمام یاغستانی اُس کے ساتھ ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہندوستان اور پنجاب کے مسلمان بھی نوشہرہ اور پشاور جا رہے ہیں۔ سیّد احمد نے ان میں کوئی اور ہی رُوح پھونک دی ہے۔ ہمیں وہاں پیش بندی کر لینی چاہیے، نہیں تو خالصہ راج زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ ہمیں مسلمانوں کو اکوڑہ اور نوشہرہ کی پہاڑیوں میں لڑانا چاہیے۔

اگر وہ لاہور کے میدانوں میں آ گئے تو وہ لڑائی میں سہولت محسوس کریں گے۔"

"بُدھ سنگھ اس وقت کہاں ہو گا؟"۔۔۔ رنجیت سنگھ نے پوچھا ۔"اُس کے ساتھ کتنا لشکر ہے؟"

"وہ دریا کے اِس طرف ہے"۔۔۔ دیوان نے اُٹھ کر جواب دیا۔۔۔ "اُس کے ساتھ تقریباً سات ہزار نفری ہے۔"

"کافی ہے"۔۔۔ رنجیت سنگھ نے کہا ۔"نہایت اچھے گھوڑے پر قاصد کو ابھی دوڑا دو۔ بُدھ سنگھ کو پیغام دو کہ فوراً اکوڑہ پہنچ جائے اور کسی موزوں جگہ پر خیمہ زن ہو جائے، لیکن لشکر کو تیاری کی حالت میں رکھے اور وہاں کے کسی مسلمان کو بھیج کر معلوم کرے کہ سیّد احمد کے ساتھ کتنی نفری ہے۔ بُدھ سنگھ اپنے فیصلے خود کرے اور سیّد احمد کے لشکر کو ختم کرے۔"

✪

ہمّت خان کو دربار سے نکال کر کاہن سنگھ لے جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ تین سکھ سپاہی تھے۔ ہمّت خان اب نہتہ تھا۔ کاہن سنگھ کو اُس پر بہت غصہ آ رہا تھا کیونکہ ہمت خان قلعے میں داخل ہُوا تھا تو کاہن سنگھ کے کہنے پر اُس نے کاہن سنگھ کو اپنی تلوار نہیں دی تھی۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بڑے دروازے کے پاس لے چلو اور ایک آدمی جا کر نائی کو لے آئے۔ کاہن سنگھ حیران تھا کہ ہمت خان منت سماجت کیوں نہیں کرتا کہ اس کی داڑھی کو نہ چھیڑا جائے اور وہ مُسکرا کیوں رہا ہے؟

"اوئے مُسلے!"۔۔۔ کاہن سنگھ نے ہمت خان کے پہلو میں ہلکا سا گھونسہ مار کر کہا ۔"تُو مہاراجہ سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتا؟ میرے پاؤں پڑ، میں شاید تجھے معاف کر کے قلعے سے نکال دوں۔"

ہمت خان نے مُسکرا کر کہا ۔"اللہ کی راہ میں ہمارے بازو اور ٹانگیں کٹ جاتی ہیں تو بھی ہم افسوس نہیں کیا کرتے یہ تو بال ہیں"۔۔۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہ ہنس پڑا۔

کاہن سنگھ پریشان ہو گیا۔ اُس نے ہمت سنگھ کو دروازے کے قریب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

روک لیا اور ایک سپاہی کو نائی کو لانے کے لیے بھیج دیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا۔ دو سوار اندر آئے۔ گھوڑوں سے اُتر کر انہوں نے گھوڑے وہیں رہنے دیئے۔ وہ دروازے پر کھڑے سنتری سے کچھ پوچھنے کے لیے رُک گئے۔ دروازہ ابھی بند نہیں ہُوا تھا کیونکہ دو بیل گاڑیاں آ رہی تھیں۔ ہمت خان نے کاہن سنگھ کو بے خبر دیکھا تو وہ دوڑ پڑا۔ گھوڑے پندرہ بیس قدم دُور تھے۔ ہمت خان اُسی رفتار سے دوڑتا اُوپر کو اُچھلا اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر جا پڑا۔ اُس نے لگام کو دروازے کی طرف جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا ہو گیا۔

کاہن سنگھ نے شور مچایا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر ہمت خان کے پیچھے گیا۔ اُس کے پیچھے دو سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے لیکن ہمت خان دُور نکل گیا تھا۔ اُس کے لیے خطرہ یہ تھا کہ نہتا تھا۔ دوسرا خطرہ یہ کہ فوجیوں کے پاس توڑے دار رائفلیں بھی آ گئی تھیں جو سامنے سے بارُود اور چھرّے بھر کر فائر کی جاتی تھیں۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے اُس پر فائر کر سکتے تھے۔ وہ عام راستے سے ہٹ گیا۔ اُس زمانے میں راوی تک کا علاقہ گھنا جنگل تھا۔ وہ اس جنگل میں دوسری سمت چلا گیا۔ چونکہ یہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے جہاں کہیں سے دریا کا پاٹ چوڑا تھا وہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہمت خان نے جنوب کی طرف دُور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اُس کے سامنے بڑا لمبا سفر تھا۔

✪

اٹک سے پشاور تک کے علاقوں پر سکھوں کی حکمرانی تھی۔ یہ حکمرانی نہیں بلکہ لُوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد، بے گار اور اندھیر نگری تھی۔ سکھوں نے اس علاقے کو تقسیم کر کے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ یہ ٹھیکیدار لوگوں سے مالیہ، لگان اور کئی قسم کے ٹیکس وصول کرتے اور سکھوں کا خزانہ بھرتے تھے۔ جہاں کہیں لوگ متحد ہو کر بغاوت کرتے، سکھ فوج جس کے جتھے جگہ جگہ موجود رہتے تھے بغاوت یا شورش کے مقام پر ٹوٹ پڑتے۔ وہاں کوئی مسلمان محفوظ نہیں رہتا تھا۔

فوج کے جانوروں کے لیے چارہ لوگوں کے کھیتوں سے کاٹ لیا جاتا۔ لوگ اناج باہر گڑھے کھود کر ان میں چھپا دیتے تھے۔ کسی مسلمان کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ عورتوں کو گھروں میں بند رکھا جاتا تھا۔

دُرّانیوں اور پٹھانوں کو یہ سزا ان کے آپس کے نفاق کی پاداش میں مل رہی تھی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آپس کی عداوت کی وجہ سے ان پر سکھ غالب آ گئے تو بھی انہوں نے متحد ہونے کی نہ سوچی بلکہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے لیے انہوں نے سکھوں کی چاپلوسی شروع کر دی اور اپنے مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ یہ صورتِ حال سکھوں کی حکومت کے لیے سُود مند تھی۔ انہوں نے پٹھانوں میں اپنے لیے غدّار پیدا کر لیے۔

عداوتیں سرداروں کی تھیں۔ سزا لوگوں کو مل رہی تھی۔ پٹھان عوام سکھوں کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اتحاد اور قیادت کے بغیر وہ ظلم و تشدد سہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالات میں سیّد احمد شہید اس علاقے میں آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے کنبوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں میں جا چھپے اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سیّد احمد شہید نے ان لوگوں کو سکھوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دی۔ لوگوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ مسجدوں سے ایک بار پھر اذانوں کی اور کلمۂ طیبہ کی بلند آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

✪

ہمت خاں جب نوشہرہ پہنچا اُس وقت وہ نیم جاں تھا۔ اُس کا چہرہ لاش کی مانند تھا۔ اُسے فوراً سیّد احمد شہید کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے ہانپتے کانپتے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُن کے پیغام اور پیغام لے جانے والے کے ساتھ کیا سُلوک کیا ہے۔ سیّد احمد شہید نے اُسی وقت جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

اُسی روز بُدھ سنگھ کی خیمہ گاہ میں جو اٹک کے کہیں قریب تھی لاہور کا سکھ قاصد پہنچا اور بُدھ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حکم نامہ دیا کہ سیّد احمد اور اس کے مریدوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے اور اگر وہ فوج کی صورت میں منظم ہوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

توحملہ کرکے انہیں ختم کر دیا جائے۔

بُدھ سنگھ نے اس سے پہلے ہی اپنا قاصد لاہور کو دوڑا دیا تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے سیّد احمد شہید کی سرگرمیوں کی اطلاع دے دی تھی۔ بُدھ سنگھ نے پیغام بھیجا کہ سیّد احمد نام کے جس آدمی کے چرچے ہم نے پہلے سُنے تھے وہ نوشہرہ تک آگیا ہے۔ ہمارے وفادار مسلمان سرداروں نے اُس کے متعلّق جو خبریں دی ہیں انہیں ہم معمولی نہیں کہہ سکتے اور اس شخص کو ہم عالم، صوفی یا درویش بھی نہیں کہہ سکتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ جنگجو ہے اور وہ کابل، قندھارا، گردونواح کے علاقوں میں فنِ سپہ گری کے کمال دکھا چکا ہے۔ مجھے مخبروں نے بتایا ہے کہ سیّد احمد نے لاہور دربار کو کوئی پیغام بھیجا ہے۔ اگر آپ نے اس پیغام کو قبول کیا تو یہ خالصہ راج کی موت کا باعث ہوگا اور اگر قاصد کو دھتکار دیا تو مسلمان سیّد احمد کے جھنڈے تلے ہم پر حملہ کریں گے۔ پٹھان اس جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں۔

بُدھ سنگھ نے پیغام میں کہا کہ اکوڑہ کا رئیس امیر خان خٹک ہمارا مخالف ہے لیکن اُس کے بھائی فیروز خان کا بیٹا خواص خان امیر خان کے خلاف ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے اکوڑہ بلایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا لشکر اکوڑہ کے قریب خیمہ زن کروں اور اُس کے چچا امیر خان خٹک اور سیّد احمد کو وہیں ختم کر دوں۔

بُدھ سنگھ نے پیغام میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ اُسے لاہور سے فوراً کمک بھیجی جائے کیونکہ سیّد احمد سے لڑائی کے دوران یا اس کے بعد ہمارے وفادار پٹھان سرداروں میں سے ایک دو نے بھی بغاوت کر دی تو میرے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُس وقت لاہور کے قلعہ دار اُودھم سنگھ اور اپنے ایک اور کمان دار ہری سنگھ کو طلب کیا اور انہیں بُدھ سنگھ کا پیغام سُنا کر حکم دیا کہ وہ انتہائی تیز رفتار سے کمک لے کر اکوڑہ روانہ ہو جائیں۔

جب سیّد احمد جنگ کی تیاری کا حکم دے رہے تھے اُس وقت بُدھ سنگھ اکوڑہ خٹک کے قریب پہنچ گیا اور اُودھم سنگھ اور ہری سنگھ اپنے دستوں کے

ساتھ اٹک کے قریب دریا عبور کر رہے تھے۔ سیّد احمد شہید کے لیے یہ جگہ نئی تھی۔ لوگ اُن کی پکار پر اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے لیکن سیّد احمد شہید محتاط تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی وفاداریاں مشکوک ہیں اور ان میں گھر کے بھیدی اور غدّار بھی ہوں گے۔ سیّد احمد شہید نہیں چاہتے تھے کہ میدانِ جنگ میں جب وہ دشمن سے گتھم گتھا ہو چکے ہوں اُن کا کوئی اپنا بھائی اُن کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دے۔ چنانچہ نئے لوگوں کی جانچ پڑتال میں بہت دن لگ گئے۔

سیّد احمد نے جو فوج تیار کی اس کی تعداد (مؤرخین کے مطابق) صرف ڈیڑھ ہزار تھی۔ سکھّوں کی نفری سات ہزار بھی لکھی گئی ہے اور دس ہزار بھی۔ اس میں اُودھم سنگھ اور ہری سنگھ کی کمک بھی شامل تھی۔ سیّد احمد شہید نے اپنی اس قلیل جمعیّت کو حسبِ معمول چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ دائیں جانب مولوی محمد یوسف کی جماعت تھی۔ بائیں بازو پر سیّد محمد یعقوب کی جماعت کو رکھا گیا لیکن اکوڑہ کی جنگ میں سیّد یعقوب نہیں تھے اس لیے قیادت اُن کے نائب شیخ بڈھن کو دی گئی۔ ہراول میں مولوی محمد اسماعیل تھے۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خان کی قیادت میں تھی جو جمعدار اللہ بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔

۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء (۲۰ جمادی الاوّل ۱۲۴۲ھ) سیّد احمد شہید نے اپنے ان چاروں کمانڈروں کا اجلاس بلایا جو ظہر کی نماز کے بعد شروع ہُوا۔

✪

اس اجلاس میں چاروں کمانڈروں کے علاوہ مجلسِ مشاورت کے ارکان بھی موجود تھے۔ سیّد احمد شہید نے حاضرین کو بتایا ”ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ سکھّوں کی نفری دس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے اپنی خیمہ گاہ کے اِردگرد پتھروں کی فصیل کھڑی کر دی ہے جسے یہ لوگ سنگھر کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے خاردار جھاڑیاں اتنی زیادہ رکھ دی ہیں جن سے گھوڑے بھی نہیں گزر سکتے۔ سنگھر ایک گز سے ذرا اونچا ہے۔ سکھ اپنی خیمہ گاہوں کو اسی طرح محفوظ کیا کرتے ہیں۔ ان کی خیمہ گاہ کے ایک طرف دریا ہے۔ ہماری کُل تعداد ڈیڑھ ہزار ہے۔ اپنے اللہ کے اس فرمان کو نہ بھولنا کہ تم اگر ایمان والے اور ثابت قدم رہے تو تم میں سے بیس دو سو پر غالب آئیں گے۔ مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس کی کو ایمان کی قوت سے پُورا کرنا ہے....

"آپ سب محسوس کرتے ہوں گے کہ اتنی قلیل نفری اتنی کثیر فوج کے خلاف آمنے سامنے کی لڑائی نہیں لڑ سکتی۔ ہمیں شبخون مارنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی ہم ضرب لگاؤ اور اِدھر اُدھر ہو جاؤ، کا طریقہ اختیار کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ لڑائی کس طرح لڑی جاتی ہے۔ آپ میں سے کون آج رات شبخون مارنے کو تیار ہے؟"

کون تھا جو کہتا کہ وہ تیار نہیں؟ لیکن سیّد احمد شہید کی نظرِ انتخاب جمعدار اللہ بخش پر پڑی۔ جمعدار اللہ بخش ہندوستان کے ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے اور انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ سیّد احمد شہید نے تحریکِ مجاہدین کا عَلَم بلند کیا تو جمعدار اللہ بخش اُن سے آملے اور اُن کے دستِ راست بن گئے۔

"مجاہدین!"۔ سیّد احمد شہید نے کہا۔ "خدائے ذوالجلال ہماری نیتوں اور ہمارے مقاصد سے آگاہ ہے۔ ہم اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے وطن سے بے وطن نہیں ہوئے۔ ہم مسلمانوں کی حکمرانی بحال کرنے نکلے ہیں۔ ہمیں ملک ہندوستان کو کفر کی غلاظت سے پاک کرنا ہے۔"

اجلاس کے حاضرین کو ایسے وعظ کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھروں سے سربکف نکلے تھے۔ انہوں نے اجلاس سے پہلے ظہر کی نماز سیّد احمد کے پیچھے پڑھی تھی۔ انہوں نے جب دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مقتدی جانتے تھے کہ اُن کا امام خدا کے حضور گڑگڑا رہا ہے اور فتح و نصرت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ بہت سے مقتدیوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

اجلاس میں سیّد احمد شہید نے ایمان اور جذبات کی باتوں کے بعد جمعدار اللہ بخش کو شبخون مارنے کے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بحث و مباحثہ ہُوا اور شبخون کی سکیم تیار ہو گئی اور یہ بھی طے ہو گیا کہ کتنی نفری جائے گی — اس نفری میں ہمّت خان بھی شامل تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اُس کے

ساتھ جو سلوک ہُوا تھا اس کا وہ انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ لاہور سے اس کی واپسی کا سفر بڑا ہی کٹھن تھا۔ اتنے دنوں کی مسلسل گھوڑ سواری، بے آرامی اور بھوک پیاس نے اُس کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں مگر اُس نے منت کر کے شبخون میں اپنا نام دے دیا۔

✪

"مسلمانوں کی نفری اتنی تھوڑی ہے کہ وہ ہمارے سائے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے"۔ اکوڑہ خٹک کے قریب سِکھوں کی خیمہ گاہ میں رات کے وقت ہری سنگھ، اُودھم سنگھ اور بُدھ سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آواز شراب کے نشے سے بے قابو سی لگتی تھی۔ اُس نے کہا۔ "بُدھ سنگھ! تم سیّد احمد کے نام سے ڈر گئے ہو۔"

"اوئے ہری سنگھا!"۔ بُدھ سنگھ نے ہری سنگھ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "چل لڑائی نہ ہوئی تو یہاں کچھ دن عیش موج کر جا.... میں سیّد احمد کے نام سے نہیں ڈرا۔ تُو بھی سوچ، اِن مُسلوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے حکومت کی ہے۔ یہ اُٹھ کھڑے ہُوئے تو نہ ہری سنگھ رہے گا نہ بُدھ سنگھ اور تیرا مہاراجہ رنجیت سنگھ مسلمانوں کے بھٹ جھونک رہا ہو گا۔"

اُودھم سنگھ پاس بیٹھا مُسکرا رہا تھا۔ اُس نے بھی کہا کہ مسلمان اگر خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو وہ اتنی تھوڑی نفری سے ہمارے مقابلے میں نہیں آئیں گے۔

اُس وقت جب یہ بات ان سکھ کمانڈروں کے دماغوں تک پہنچ چکی تھی، ایک نوجوان سکھ خیمہ گاہ کی حفاظتی فصیل کے باہر دبے پاؤں چل رہا تھا۔ وہ بھی ان جھاڑیوں کو دیکھتا جو پتھروں کی فصیل کے ساتھ کچھی تھیں، کبھی اڑیاں اُٹھا کر فصیل کے اوپر سے خیمہ گاہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ رات کی تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خیمہ گاہ میں خاموشی تھی۔ یہ نیند کا سکوت تھا جسے کبھی کسی گھوڑے کی آواز اور کبھی کسی سنتری کی آواز توڑتی اور رات پھر خاموش ہو جاتی۔

یہ نوجوان سکھ تمام تر خیمہ گاہ کے گرد گھوم گیا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ کچھ دُور جا کر اُسے آواز سنائی دی — "آ گئے ہمّت خان!"۔ وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اُس طرف گیا۔ اُس نے مصنوعی داڑھی چہرے سے نوچ کر پھینک دی۔ اس کے نیچے اُس کی اپنی بڑی خوبصورت داڑھی تھی۔ اُس نے سر سے پگڑی بھی اُتار پھینکی جو اُس نے سکھوں کی طرح باندھ رکھی تھی ـــــ وہ سکھ نہیں ہمت خان تھا جو سکھوں کے بھیس میں خیمہ گاہ کا جائزہ لینے گیا تھا اور اُس کے انتظار میں جمعدار اللہ بخش کھڑا تھا۔ ہمت خان نے جمعدار اللہ بخش کو خیمہ گاہ کی کیفیت تفصیل سے بتائی اور کہا کہ شبخون کے لیے فضا صاف ہے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ ان چھاپہ مار جانبازوں نے مقامی پٹھانوں کی راہنمائی میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے دریائے کابل عبور کیا تھا کیونکہ خشکی کے راستے پر سکھ فوج گشت پر رہتے تھے اور گشت کی نفری زیادہ ہوتی تھی۔ دریا پار کر کے ہمت خان کو خیمہ گاہ کے جائزے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہمت خان نے سنگھر میں ایک جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے اندر جایا جا سکتا تھا۔

جمعدار اللہ بخش نے اپنے جانباز چھاپہ ماروں کو آخری ہدایات دیں اور کہا ـــ "ہم سب نے ایک دوسرے کا کہا سُنا معاف کر دیا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کون زندہ واپس جائے گا۔ صرف یہ خیال اپنے سامنے رکھو کہ آج کا شبخون تمہارا آخری فرض ہے اور اس کے بعد تم خدا کے حضور چلے جاؤ گے۔ اب یہ فیصلہ خود کرو کہ اللہ کے حضور سُرخرو ہو کر جانا ہے یا فرض سے نظریں چُرا کر ملعون کے رُوپ میں"۔

چھاپہ ماروں کے اس جتھے میں سے کسی کی بھی آواز نہ نکلی کیونکہ انہیں خاموشی برقرار رکھنے کی بڑی سخت ہدایت دی گئی تھی۔ انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے یوں سینوں میں روک رکھے تھے جیسے عقابوں کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پنجرے توڑنے کو پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

✪

دس ہزار سکھوں کی خیمہ گاہ میں نیند کا موت جیسا سکوت طاری تھا۔ بے ہوشی کی اس نیند میں دیسی شراب کا عمل دخل زیادہ تھا۔ سکھ شراب کے بغیر اُس پودے کی مانند ہوتا ہے جسے پانی نہ ملے۔ لہٰذا سکھوں کی فوج کو پانی بعد

میں اور شراب پہلے دی جاتی تھی۔ وہ شراب کے زور پر لڑتے تھے۔ سنتری بیدار تھے اور گھوم پھر رہے تھے۔ چھاپہ مار دبے پاؤں خیمہ گاہ کی حفاظتی باڑ اور پتھروں کے سنگھر سے دُور دُور ہمت خان کی راہنمائی میں اُس مقام تک جا رہے تھے جہاں سے اندر جانا تھا۔

بعض مؤرخوں نے چھاپہ ماروں کی نفری ایک سو لکھی ہے اور بعض نے نو سو کے قریب، لیکن شبخون میں اکثر کم سے کم نفری لے جائی جاتی تھی۔ تعداد نو سو نہیں ہو سکتی۔ بہرحال یہ جتھہ اُس مقام کے قریب پہنچ گیا۔ جمعدار اللہ بخش نے وہ جگہ دیکھی اور سنگھر کے باہر کی خاردار جھاڑیاں ایک طرف کرا دیں اور دو دو چھاپہ مار دیوار سے اندر کُود گئے۔ انہوں نے اندر کی طرف بچھائی ہوئی جھاڑیاں ہٹا دیں۔ وہاں سے کچھ اور چھاپہ مار اندر چلے گئے۔ ان میں سے چار اپنی تلواریں سونتے ایک جگہ چھپ گئے تاکہ سنتری اِدھر آئیں تو انہیں ختم کر دیا جائے۔

ہمت خان جب اکیلا آیا تھا تو یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ سنتریوں کے پاس ہتھیار کیا ہیں۔ ان کے پاس برچھیاں نہیں بلکہ توڑے دار بندوقیں تھیں.... چھاپہ مار اندر چلے گئے۔ انہوں نے اس طرف کے خیموں کی رسّیاں کاٹ دیں اور اوپر سے برچھیاں مارنے لگے۔ خیموں میں دبے ہوئے سکھ مرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ شور اُٹھا تو کسی سنتری نے اِدھر کو بندوق کر کے فائر کر دیا۔ تمام چھپے مولانا باقر علی عظیم آبادی کے سینے میں اُتر گئے۔ مولانا نے بلند آواز سے پکارا ـــ "میرے دوستو! مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کی امانت ہے۔ انہیں دشمن ہاتھ نہ لگائے"ـــ وہ گرے اور شہید ہو گئے۔ وہ اس شبخون کے پہلے شہید تھے۔

اس کے بعد ایک قہر تھا جو سکھوں پر ٹوٹ پڑا، ایک قیامت تھی جو بپا ہوئی۔ مجاہدین خیموں کی رسّیاں کاٹتے اور گرے ہوئے خیموں میں برچھیاں مارتے چلے جاتے تھے۔ کسی مجاہد چھاپہ مار نے ایک خیمے کو آگ لگا دی۔ سکھوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ اتنی مخلوق ہڑبڑا کر بیدار ہوئی، اپنے ساتھیوں کی چیخ و پکار اور اللہ اکبر کے نعروں کی گرج سُنی تو سوائے بھاگنے کے کچھ نہ سوچ سکی۔ بہت کم سکھوں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مقابلے کے لیے تیار

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوئے لیکن سامنے کوئی دشمن ہوتا تو مقابلہ کرتے۔ وہاں تو بھگدڑ اور نفسا نفسی تھی۔

جمعدار اللہ بخش کی نظر سکھوں کی توپوں پر تھی۔ انہوں نے چند ایک چھاپہ مار اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک سکھ کو پکڑ لیا اور اُسے جان بخشی کا وعدہ دے کر پوچھا کہ توپیں کہاں ہیں۔ سکھ انہیں توپوں تک لے گیا۔ جمعدار اللہ بخش نے اُسے بھگا دیا۔ اب یہ توپیں مجاہدین کی تھیں۔ خیمہ گاہ میں کئی جگہوں سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ خوفناک تھی۔ وہ آگ اور غل غپاڑے سے بدکتے اور بڑی زور زور سے ہنہناتے تھے۔ اِکّی دُکّی گولی بھی چلتی تھی۔

✪

کمانڈار اُودھم سنگھ کا خیمہ کچھ دُور تھا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اُٹھا۔ خیمے سے باہر آیا تو اُس کا دل ڈوب گیا۔ اُس کی دس ہزار نفری کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ وہ بُدھ سنگھ کے خیمے میں دوڑتا گیا مگر خیمہ خالی تھا۔ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ بُدھ سنگھ اس ڈر سے بھاگ گیا ہے کہ مسلمانوں کی بہت زیادہ نفری نے حملہ کر دیا ہے اور اب جان بچانے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہری سنگھ بھی لاپتہ تھا۔

جمعدار اللہ بخش نے دیکھا کہ شبخون کا مقصد پورا ہو چکا ہے تو اُس نے اپنے ساتھ جو تین قاصد رکھے ہوئے تھے انہیں کہا کہ مجاہدین سے چلّا چلّا کر کہو کہ خیمہ گاہ سے نکلو اور دریا کے کنارے پہنچو۔ جمعدار اللہ بخش نے خود بھی بڑی بلند آواز میں احکام دینے شروع کر دیئے مگر مجاہدین اپنی کامیابی سے اس قدر سرشار تھے کہ کوئی حکم نہیں مان رہے تھے۔ دس ہزار نفری کی خیمہ گاہ جس میں رسد، گھوڑے اور بیل گاڑیوں کے بیل اور سینکڑوں ملازم بھی تھے، دو میل سے زیادہ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مجاہدین سکھوں کی بندوقیں، بارُود اور دیگر ہتھیار اکٹھے کر رہے تھے۔

آخر اکبر خان نام کے مجاہد کی کوششوں سے مجاہدین خیمہ گاہ سے نکلنے لگے۔ اُس وقت بھی بندوقیں فائر ہو رہی تھیں۔ کہیں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ جمعدار اللہ بخش مجاہدین کو باہر نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے کہ کسی بندوق

کے چھرّے اُن کے جسم کو چھلنی کر گئے اور وہ شہید ہو گئے۔ اکبر خان نے جو قندھار کے رہنے والے تھے، دیکھ لیا اور چھاپہ ماروں کی قیادت سنبھال لی۔

صبح صادق کا وقت تھا جب چھاپہ مار مجاہدین خیمہ گاہ سے تقریباً دو میل دُور اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اذان دی اور نمازِ فجر باجماعت پڑھی۔ نماز کے بعد شہیدوں کے لیے دُعائے مغفرت کی ــــ جماعت میں سے جو جانباز غیر حاضر تھے ان میں ہمّت خان بھی تھا۔ اس کے متعلق یہی سمجھ لیا گیا تھا کہ شہید ہو گیا ہے۔

✪

اُودھم سنگھ کی آنکھ اُس وقت کھلی تھی جب چھاپہ مار خیمہ گاہ پر چھا چکے تھے اور سکھوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اُسے اپنے دونوں ساتھی کمانڈر بُدھ سنگھ اور ہری سنگھ نہ ملے تو وہ ایک طرف ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ کمانڈ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اس صورتِ حال پر قابو پانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی فوج میں جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو کمانڈر اپنے دستوں پر قابو نہیں پا سکتے۔

اُس نے اپنی کرپان بھی نیام سے نہ نکالی اور ایک طرف چل پڑا۔ خیموں اور دیگر جلتے ہوئے سامان کے شعلوں کی روشنی اتنی تھی کہ اُسے نظر آ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے سکھ سپاہیوں کی لاشوں سے ٹھوکریں بھی کھائیں اور وہ خیمہ گاہ کے دروازے تک چلا گیا۔ بندوقیں بھی فائر ہو رہی تھیں۔ وہ کسی بندوق کے فائر کیے ہوئے چھرّوں کی زد میں آ گیا۔ زیادہ تر چھرّے اُس کے بازو میں اُترے اور کچھ سینے کے ایک طرف پٹھے میں اور کچھ سر میں لگے۔ وہ دروازے سے نکل گیا۔ وہ سنگھ کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اُسے چکر آیا پھر وہ گر پڑا۔

ہمّت خان اُس وقت خیمہ گاہ سے نکلا جب اُس کے سارے ساتھی جو زندہ تھے جا چکے تھے۔ اُس نے اپنی بے عزّتی کا انتقام لے لیا تھا۔ خیمہ گاہ کے دروازے سے نکلتے اُس نے خیمہ گاہ کو دیکھا۔ شعلے بجھتے جا رہے تھے۔ خیمہ گاہ تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہمّت خان کو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اُس کے قریب سے سکھ دوڑتے گزر رہے تھے۔ اُس کی طرف کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

ہمّت خان سنگھر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ جہاں سنگھر ختم ہُوا وہاں سے زمین نیچے کو جا رہی تھی۔ وہ نیچے اُترنے لگا اور اس کے دائیں بائیں دو ٹیکریاں آگئیں۔ ان سے گذرتے صبح کی سپیدی نکھرنے لگی۔ اُس کے ساتھی نماز پڑھ کر اُس کے لیے دُعائے مغفرت کر چکے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی زمین پر پڑا ہے۔ وہ لاش ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اُس کے قریب گیا کہ یہ کوئی اُس کا اپنا ساتھی ہی نہ ہو۔

وہ اُس کا اپنا ساتھی نہیں کوئی سکھ تھا۔ اُس نے حقارت سے ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن صبح اتنی صاف ہو چکی تھی کہ اُسے اُس شخص کا چہرہ اچھی طرح نظر آگیا۔ ہمّت خان نے جُھک کر اُسے دیکھا تو اُس کے مُنہ سے نکلا — "اوہ، یہ تو اُودھم سنگھ ہے" — تب اُس نے اُس کی نبض پر اُنگلیاں رکھیں۔ وہ زندہ تھا۔ ہمّت خان کو لاہور قلعے میں اُودھم سنگھ کا سلوک یاد تھا۔ اُس نے وہاں ہمت خان کی یہ عزّت افزائی کی تھی کہ جب اُسے کہا جا رہا تھا کہ وہ تلوار اُتار دے تو اُودھم سنگھ نے سکھّوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اُس کی تلوار اُس کے پاس رہنے دیں۔ دربار میں تمام محافظوں نے تلواریں نکال لی تھیں اور سارے درباری اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت اُس نے اُودھم سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جو اُسے غصیلی نظروں سے گھُور نہیں رہا تھا اور اُس نے اپنی کرپان کے دستے پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ اُس رات اُودھم سنگھ اُس کے پاس مہمان خانے میں گیا اور اُس کی باتیں توجّہ سے سُنی تھیں۔ اُودھم سنگھ کے اس سلوک کے علاوہ ہمت خان نے اس شخص میں نہ جانے کیا دیکھا تھا کہ وہ اُسے اچھا لگا تھا۔

اُس نے کہا — "اُودھم سنگھ! زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن میں تمہیں یہاں نہیں مرنے دوں گا۔ تمہیں بچانے کی کوشش ضرور کروں گا" — لیکن اُودھم سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ ہمّت خان نے گھٹنے ٹیک کر اُسے اُٹھایا اور کندھے پر ڈال کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اتنے قوی ہیکل آدمی کے

بوجھ تلے وہ چل پڑا۔

✪

اُودھم سنگھ ہوش میں آیا تو اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اِدھر اُدھر اور اُوپر دیکھا۔ اُسے اپنے اوپر چھت نظر آئی اور اُس کے پاس جانی پہچانی شکل و صورت کا ایک جواں سال آدمی بیٹھا تھا۔ اُودھم سنگھ نے اپنا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہُوا پایا۔ سر پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی — "ہمّت خان؟ .... مجھے تم یہاں لائے ہو؟"

جب ہمّت خان نے اُسے بتایا کہ وہ کہاں سے اور کس طرح اُسے اُٹھا لایا ہے تو اُودھم سنگھ حیرت سے جیسے سُن ہو گیا ہو۔ وہ اس علاقے کی دشواریوں اور فاصلوں سے واقف تھا۔ اتنے میں ایک آدمی اندر آیا اور اُس نے کہا —— "امیرالمؤمنین تشریف لا رہے ہیں" — ہمّت خان اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سیّد احمد شہید اندر آئے۔ اُودھم سنگھ اُٹھ بیٹھا اور بڑے غور سے سیّد صاحب کو دیکھنے لگا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے زخم گہرے نہیں" — سیّد احمد شہید نے اُودھم سنگھ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمّت خان نے مجھے بتایا ہے کہ لاہور میں آپ نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ہمارا سلوک بھی آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

"میں آپ کا قیدی ہوں" — اُودھم سنگھ نے کہا — "آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں اگر مایوس ہوں گا بھی تو آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔"

"آپ ہمارے قیدی نہیں مہمان ہیں" — سیّد احمد شہید نے کہا۔ "زخم ٹھیک ہونے تک آپ ہمارے مہمان رہیں گے، پھر آپ کو اُسی عزت اور احترام سے رخصت کیا جائے گا جو ایک کماندار اور قلعہ دار کا حق ہے۔ میں آپ کے لیے دُعا کروں گا۔ آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے" — اور سیّد صاحب اُودھم سنگھ کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

اُودھم سنگھ کی نظریں دروازے پر جمی رہیں جس میں سے سیّد احمد شہید نکل گئے تھے۔ ہمّت خان کی آواز نے اُسے چونکا دیا — "یہ ہیں سیّد احمد، ہمارے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سالارِ اعلیٰ اور امیر المومنین جن کے متعلق آپ نے مجھ سے لاہور قلعے میں پوچھا تھا۔"

"ہاں، یہ شخص اپنے آپ میں جادو کا اثر رکھتا ہے"۔۔۔ اُودھم سنگھ نے کہا۔

جس مکان میں اُودھم سنگھ کو رکھا گیا تھا یہ اکوڑہ خٹک سے کچھ دُور ایک گاؤں کا کچا مکان تھا۔ اُودھم سنگھ کی ہر روز مرہم پٹی ہونے لگی اور اُسے نہایت اچھا کھانا دیا جانے لگا۔ سیّد احمد شہید اُس کی تیمارداری کو آتے تھے۔ انہوں نے اُس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے دشمن یا غیر مسلم سمجھا جا رہا ہے۔ علی الصبح اُس کے کانوں میں بڑی سُریلی آواز پڑتی۔ اُودھم سنگھ کو معلوم تھا کہ کوئی قرآن پڑھ رہا ہے لیکن کسی آواز میں کبھی اُس نے یہ تاثر محسوس نہیں کیا تھا۔

ایک روز ہمّت خان اُس کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ اُودھم سنگھ جیسے پھٹ پڑا۔ بولا۔۔۔ "ہمّت خاناں! میں سکھ ہوں۔ مجھ پر رحم نہ کرو۔ ہم مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر مارتے ہیں تو ہمیں لطف آتا ہے۔ ہم مسلمان عورتوں کی عزت لُوٹ کرنا چاہا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچّوں کو قتل کر کے ہم قہقہے لگایا کرتے ہیں۔ تم میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟"

"ہم یہ نہیں دیکھ رہے کہ آپ سکھ ہیں"۔۔۔ ہمّت خان نے کہا۔ "ہم یہ یاد رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم صرف میدانِ جنگ میں قتال کرتے ہیں۔ عورت، بچّہ، نہتّہ آدمی اور زخمی کسی بھی قوم کا ہو ہم اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ ہمارے امیر المومنین نے آپ کے مہاراجہ کو قبولِ اسلام کا پیغام بھیجا ہے لیکن آپ کو نہیں کہا کہ اسلام قبول کرلیں کیونکہ آپ ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔"

"اگر میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لوں تو؟"

"ہمیں یقین کرنا پڑے گا کہ آپ کسی خوف یا لالچ سے اسلام قبول نہیں کر رہے"۔۔۔ ہمّت خان نے جواب دیا۔

ایک روز اُودھم سنگھ کو جب وہ صحت یاب ہو چکا تھا اور باہر گھومنے پھرنے لگا تھا، پتہ چلا کہ سیّد احمد شہید گاؤں میں موجود ہیں۔ وہ اُن کے کمرے میں چلا گیا اور اُن کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا کہ اُسے مسلمان کر لیا جائے۔ اُسے کہا گیا کہ وہ آزاد ہے وہ واپس جا سکتا ہے لیکن اُس نے یہی ایک رَٹ جاری رکھی کہ وہ مسلمان ہونا

چاہتا ہے۔ آخر سیّد احمد شہید نے اُسے کلمہ طیّبہ پڑھا کر مسلمان کر لیا اور اُس کا نام اسماعیل رکھا۔

مسلمان ہو کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اور جوان بہن بھی اُس کے ساتھ آئی تھیں۔ اُس زمانے میں کماندار اور عہدیدار اپنی بیویوں کو اور بعض اپنے کنبوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اُودھم سنگھ اپنی ماں اور اپنی بہن کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ انہیں خیمہ گاہ میں رکھنے کی بجائے اُس نے انہیں اکوڑہ سے کچھ دُور ایک گاؤں میں رکھا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ انہیں اپنے پاس لانا چاہتا ہے۔ وہ علاقہ سکھوں کی بڑی ظالم عملداری میں تھا۔

وہ انہیں لانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجاہدین کے ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ اسماعیل کے قبولِ اسلام کی خبر بُدھ سنگھ تک پہنچ گئی ہے اور اُس نے حکم دیا ہے کہ اسماعیل (اُودھم سنگھ) کی ماں اور بہن کو پکڑ لاؤ۔ وہ اُودھم سنگھ کی غدّاری کی سزا اُس کی ماں اور بہن کو دینا چاہتا ہے۔ بدھ سنگھ کے حکم سے دس بارہ سکھ اُس گاؤں کو روانہ ہو گئے تھے۔

سیّد احمد شہید نے اِدھر سے اسماعیل کے ساتھ دس بارہ مجاہدین بھیج دیئے۔ ان میں ہمّت خان بھی تھا۔ یہ جماعت جب اُس گاؤں میں پہنچی تو وہاں خوف و ہراس طاری تھا۔ معلوم ہُوا کہ بُدھ سنگھ کے سپاہی پہلے پہنچ گئے ہیں۔ اسماعیل اور مجاہدین بھاگم بھاگ پہنچے۔ مکان کے باہر سکھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجاہدین کو باہر ہی روک لیا اور ان میں خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ اسماعیل اور ہمّت خان مکان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام رہے۔ آخر دونوں پچھواڑے سے اندر گئے۔

اندر کا یہ حال تھا کہ اسماعیل کی ماں تلوار کے زخموں سے مری پڑی تھی اور اُس کی بہن پرتیم کور کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے بتایا کہ سکھ سپاہی اندر آئے اور پرتیم کور کو پکڑ کر اُس کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ماں نے تلوار نکال لی اور سکھوں پر حملہ کیا لیکن دو سکھوں نے اُسے ختم کر دیا۔ پرتیم کور کو وہ بے آبرو کرنا چاہتے تھے کہ باہر شور اٹھا۔ اندر والے سکھ باہر گئے اور اسماعیل اور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمت خان اندر چلے گئے۔ اس طرح پریتم کور کی آبرو محفوظ رہی۔ اسماعیل اور ہمت خان پچھواڑے سے ہی پریتم کور کو نکال لے گئے۔ مجاہدین میں سے دو تین شہید ہو گئے باقی نکل گئے۔

سیّد احمد شہید کے گاؤں میں لا کر اسماعیل نے اپنی بہن کو بتایا کہ وہ اب اُودھم سنگھ نہیں اسماعیل ہے۔ اُس نے جب بہن کو بتایا کہ وہ کیوں مسلمان ہُوا ہے تو بہن نے بھی مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ سیّد احمد شہید نے اُسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام زینب رکھا۔ زینب جوان لڑکی تھی۔ اسماعیل کی خواہش پر ہمّت خان اور زینب کی شادی کر دی گئی۔ سیّد احمد شہید نے قندھار کے ایک مجاہد کی بیٹی کو اسماعیل سے منسوب کر دیا لیکن اسماعیل نے کہا کہ وہ اگلی لڑائی کے بعد شادی کرے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سیّد احمد شہید نے اٹک پر حملہ کیا جو خادے خان والیٔ ہُنڈ کی غدّاری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اسماعیل اس حملے میں شہید ہو گیا۔

قاضی عبدالعلیم اثر افغانی نے اپنی کتاب "روحانی رابطہ" میں لکھا ہے کہ سیّد احمد شہید نے اسماعیل کی لاش دیکھی تو اُن کے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے کہا — "آخر میرے سجیلے نے شہادت کا سہرا باندھ ہی لیا"۔

بالاکوٹ کے میدانِ جنگ میں

یہ داستانِ عزیمت ۱۸۳۱ء کی ہے اور یہ سیّد احمد شہید اور اُن کے مجاہدین کی داستانِ شہادت ہے اور یہ ایمان فروشوں کی کہانی بھی ہے۔ میدانِ جنگ وادیٔ کاغان تھا۔ معرکہ سکھوں اور مجاہدینِ اسلام کا تھا جس کے قائدین میں سیّد احمد شہید، مولوی اسمٰعیل شہید اور مولوی خیر الدّین شہید تھے۔

۱۸۳۱ء کے سال کی ابتدا تھی۔ ہزارہ کے پہاڑی علاقے کے درّوں میں بھوگڑ منگ کو خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ یہ شنکیاری کے سر پر تھا اور وہاں سکھوں نے چھاؤنی بنا رکھی تھی۔ درّے کے اندر سب لوگ ان کو خراج دینے پر مجبور تھے۔ سکھوں کو وہاں دیکھ کر جہاد کا ولولہ ایک بار پھر اُبھر آیا اور فیصلہ ہُوا کہ سکھوں پر حملہ کر کے انہیں یہاں سے نکال دیا جائے اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ درّے کے لوگ اب "عشر" مجاہدین کے لئے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ مولوی اسمٰعیل کی سرکردگی میں چار سَو غازیوں کا لشکر بھوگڑ منگ کی طرف بھیج دیا گیا۔ مولوی خیر الدّین شیر کوٹی کو نائب مقرر کیا گیا تھا۔ سکھوں نے مجاہدین کی آمد دیکھی تو شنکیاری کی گڑھی میں مقیم ہو گئے۔ مقامی لوگوں نے سکھوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا اور مالیہ بخوشی مجاہدین کو دینا شروع کر دیا۔ مجاہدین نے اُن کو یقین دلایا کہ سکھوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا تو مجاہدین اُن کو روکنے کے ذمّہ دار ہوں گے۔ اس بنا پر درّے کے باہر چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ بھوگڑ منگ کے بعد غازیوں کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ایک دستہ سچون بھیج دیا گیا جو بھوگڑ منگ سے چند میل شمال میں واقع ہے۔

جہاد کے آغاز کے لئے ضروری تھا کہ اردگرد کے حالات کا جائزہ لیا جاتے اور جب برفباری کا موسم ختم ہو تو آغازِ جہاد کیا جائے۔ اس خطے میں بھی مسلمانوں میں نفاق اور تفریق کا مرض زوروں پر تھا۔ ان میں سے ایک گروہ نے سکھوں کی مدد سے اقتدار حاصل کر رکھا تھا اور دوسرا گروہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ نجف خان گھوڑی والا اپنی ریاست سے نکل کر کوہ ورابہ میں بیٹھا تھا۔ راجہ منصور خان والیِ ملک ورابہ اپنے بھائی مظفر خان کے خوف سے چھپا پھرتا تھا۔ حبیب اللہ خان مالک گڑھی اپنی زمینداری کو چھوڑ کر بالاکوٹ سے بھی آگے درۂ کاغان میں مقیم تھا۔ ان سب مقہورین اور مغرورین نے سیّد احمد شہید سے دستگیری کی درخواستیں کی تھیں۔

سیّد احمد شہید نے مولوی اسمٰعیل اور مولوی خیرالدین کو بالاکوٹ کی تسخیر کے لئے منتخب کیا۔ بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔ حسب الحکم ۲۷ شعبان ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۳۱ء ظہر کے وقت مولوی خیرالدین بھوگڑ منگ سے روانہ ہوتے۔ یہاں سے بالاکوٹ تین کوس کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں بڑا دشوار گزار پہاڑ تھا۔ برف باری نے سفر کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ بایں ہمہ مولوی خیرالدین بالاکوٹ پہنچ گئے۔ خوانین کو مجاہدین کی نقل و حرکت معلوم ہوتی تو انہوں نے پیغام بھیجا کہ مظفر آباد کا نجف خان اپنے محسن سکھ جرنیل شیر سنگھ کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے اور مظفر آباد خالی پڑا ہے۔ مولوی اسمٰعیل جسمانی طور پر خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ اکثر علیل رہتے تھے۔ پھر بھی بالاکوٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے تاکہ مولوی خیرالدین کے ساتھ رہیں۔ دوسرے ہی دن بالاکوٹ پہنچ گئے، اگرچہ سفر کی تکالیف سے لاچار ہو گئے تھے۔

اس دوران معلوم ہوا کہ سکھوں کا لشکر بھوگڑ منگ پر حملہ کرنے کی غرض سے درّے کے باہر جمع ہو رہا ہے۔ چنانچہ سیّد احمد شہید خود راج دواری سے سچون کے لئے روانہ ہوئے۔ اُن کے ہمراہ تین چار سو مجاہدین تھے اور

۲۴ رمضان المبارک کو سچون پہنچ گئے۔ کاغان کا سیّد ضامن شاہ بیعت کے لئے بمع اقربا حاضر ہوا اور جہاد میں جان و مال سے شرکت کا عہد کیا۔ سلطان زبردست خان اور راجہ مظفر خان کے مشورے سے مجاہدین نے ایک لشکر مظفر آباد کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ لشکر مولوی خیرالدین شیر کوٹی کے زیرِ کمان تھا۔ مُلّا قطب الدین ننگرہاری اور منصور خان قندھاری الگ الگ جیشوں کے سردار مقرر کئے گئے۔ اس طرح مجاہدین تین ٹولیوں میں منقسم تھے۔ غازیوں نے مظفر آباد پہنچتے ہی بازارِ پرا اور زبردست خان کے محل پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے ہاتھ میں چھاؤنی اور گڑھی رہ گئی تھی۔

زبردست خان کو جب اُس کا محل مل گیا تو اُس نے سکھوں سے سازباز شروع کر دی اور مجاہدین سے جس امداد کا وعدہ کیا تھا، اس میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ منصور خان قندھاری اور قطب الدین ننگرہاری کو اس قدر غصہ آیا کہ انہوں نے چھاؤنی پر حملہ کر دیا جس سے مقصد یہ تھا کہ زبردست خان کی سازش کو ناکام بنا دیا جائے۔ سکھوں سے بڑی سخت جنگ ہوئی۔ آخر چھاؤنی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ یہ حملہ سالارِ لشکر مولوی خیرالدین کی اجازت کے بغیر ہوا تھا لیکن چھاؤنی پر قبضہ ہو جانے کے باعث یہ خطا معاف کر دی گئی۔ زخمی مجاہدین کو بالاکوٹ پہنچا دیا گیا۔ سیّد احمد شہید بھی وہیں تھے۔

کشمیر کے راستے پر مظفر آباد ایک اہم مقام ہے اس لئے اس پر سکھوں کا قبضہ گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا مگر زبردست خان کے غدّارانہ روّیے کے باعث مجاہدین کی جماعت کو یہاں ٹھہراتے رکھنا دانشمندی سے بعید تھا۔ یُوں فیصلہ کُن جنگی اقدامات کے بہترین مواقع ضائع کر دیتے گئے۔ دراصل مجاہدین ابھی کسی جنگ کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ دُور دراز کی مسافت طے کر کے جان لیوا مشقتوں سے اس مقام پر پہنچے تھے۔ تھکے ماندے تھے اور کچھ بیمار بھی تھے۔ اکثر موسم کی شدید سردی سے نڈھال تھے اور چاہتے تھے کہ کچھ دن اور ستا لیں اور تازہ دم ہو جائیں۔ سامانِ جنگ بھی کافی نہ تھا۔ اس کا بیشتر حصّہ وہ پیچھے چھوڑ آتے تھے کیونکہ پہاڑوں کے دشوار گذار راستوں سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اسے اُٹھا کر لانا ابھی اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایسے مقام کی بھی تلاش میں تھے جو دشمن کی نظر سے اوجھل اور ان کی یلغار سے محفوظ ہو، حتیٰ کہ غازیوں کا اجتماع مکمل ہو جاتا۔ کاغان کے باشندوں کے احوال و اخلاق سے بھی ناواقف تھے۔ اُن کی عسکری قابلیت اور شجاعت کا راز ابھی ان پر نہیں کھلا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مظفر آباد کی جنگ میں مولوی خیر الدین بار بار زبردست خان سے وعدے پورے کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ مجاہدین اجنبی ملک میں تھے۔ وہاں کے باشندوں کی زبان سے بھی ناواقف۔ سامانِ جنگ بھی کافی نہ تھا۔ سکھوں کی برتری اور مسلمانوں پر اُن کے مظالم بھی نہیں دیکھے جاتے تھے۔

دشمن تیاری کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ مجاہدین جن لوگوں اور رؤسا کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے تھے وہ شکست خوردہ تھے۔ کامیاب اور حکمران طبقے کے ساتھ ان کی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو سکھوں کے رحم و کرم پر جی رہے تھے۔ ان میں کچھ سکھوں کے ایجنٹ بھی تھے۔ سکھوں کا کھاتے اور مجبور لوگوں پر اپنا رعب گانٹھتے تھے۔ پھر بھی مجاہدین کے قائدین نے قدم جما لئے۔ مقامی آبادی کو ساتھ ملانے کا وسیلہ مال و دولت ہو سکتا تھا جو مجاہدین کے پاس نہیں تھا۔ مظالم اور مفلسی نے انہیں اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مجاہدین کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھے۔ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔ سکھوں کے ساتھ صلح جوئی کی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

شیر سنگھ اور نجف خان کو جب خبر ہوئی تو وہ گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئے۔ زبردست خان نے مولوی خیر الدین سے پوچھا کہ وہ اب کیا کریں گے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ مجھے ان خطرات کا پہلے سے احساس تھا۔ اب بھی اس خطرے کی روک تھام ممکن ہے بشرطیکہ میرے لشکر کے لئے ضروری سامان فراہم کر دیں اور جو مقامات سخت خطرے میں ہیں وہ میرے حوالے کر دیں —— زبردست خان صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ مولوی

خیر الدین نے مجاہدین کو مظفر آباد سے واپس بلا لیا۔ شیر سنگھ نے بھی اپنا ارادہ بدل لیا اور بھوگڑمنگ اور سچون پر جہاں سید احمد شہید مقیم تھے حملے کی تیاری کرنے لگا۔ مولوی صاحب نے خبر پا کر سید احمد شہید کو خبردار کر دیا اور خود گڑھی حبیب اللہ پر شبخون مارنے کی تیاریاں کیں جہاں شیر سنگھ مقیم ہو گیا تھا، لیکن سید احمد شہید نے تمام مجاہدین کو سچون طلب کر لیا۔ چنانچہ مجاہدین بالاکوٹ کو حبیب اللہ کے سپرد کر کے سچون چلے گئے۔

راجہ شیر سنگھ نے میدان خالی پا کر بالاکوٹ پر چڑھائی شروع کر دی۔ جب یہ لشکر دو کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو حبیب اللہ خان نے سید احمد شہید سے مدد طلب کی۔ سید احمد شہید کل لشکر کے ساتھ بالاکوٹ چلے گئے۔ مجاہدین کی تھوڑی سی نفری کو سچون اور بھوگڑمنگ رہنے دیا گیا۔ مجاہدین کی خواہش تھی کہ جلد از جلد بالاکوٹ پہنچ جائیں مگر برفباری اور دشوار گذار راستوں نے انہیں جلدی نہ پہنچنے دیا۔ سچون سے بالاکوٹ کا وہ راستہ جس پہ دشمن کی آمد کا خطرہ نہ تھا بڑا ہی دشوار گذار تھا اور برف سے اٹ گیا تھا۔ سید احمد شہید نے گوجروں کو ملازم رکھ کر برف ہٹانے پر لگا رکھا تھا۔ اس طرح یہ تھوڑا سا فاصلہ چار روز میں طے ہوا۔ ارباب بہرام خان شار کولی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں بھی سچون بلا لیا گیا تھا۔ ان کے ہمراہ بیس مجاہد تھے۔

سید احمد شہید ۱۷ مارچ ۱۸۳۱ء بروز اتوار سچون سے بالاکوٹ گئے تھے۔

بالاکوٹ پہنچے تو ست بنے کے نالے پر اُن کا استقبال کیا گیا۔ واصل خان کی حویلی میں فروکش ہوئے جو مسجد بالا کے قریب تھی اور اُن کے لئے خالی کرائی گئی تھی —— بالاکوٹ ایک قدرتی پشتے یا ٹیلے پر ایک گنجان آباد قصبہ ہے۔ مکان چھوٹے چھوٹے اور گلیاں تنگ اور پیچ دار تھیں۔ یہ قصبہ کاغان، کیلاش، گلگت اور شمالی کوہستانی علاقوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ اس کے جنوب مشرق میں دریائے کنہار بہتا ہے اور اس مقام پر کتنی ایک پہاڑی نالے اس میں آکر گرتے ہیں۔ وہاں ایک پل ڈال دیا گیا تھا۔ دو تین مسجدیں بھی تھیں۔ مسجد کلاں جنوب مغربی حصے میں تھی۔ اس بڑی مسجد میں صرف پچاس ساٹھ آدمی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نماز پڑھ سکتے تھے۔ ستّ بنیتے کے نالے پر کھڑے ہو کر مغربی سمت کو دیکھیں تو ایک بلند پہاڑ نظر آتا ہے۔ یہ شمال سے جنوب تک پھیلا ہُوا ہے۔

شیر سنگھ کا لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر پڑا تھا اور بالاکوٹ سے کوئی دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کنارے پر جانوروں کو چرانے کے لئے جگہ کافی نہیں تھی۔ اسی لئے وہاں پُل ڈالا گیا تھا کہ جانوروں کو چرانے کے لئے مغربی کنارے پر لایا جا سکے ..... سیّد احمد شہید نے بالاکوٹ پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بالاکوٹ کی طرف آنے والے راستوں کی ناکہ بندی کے لئے دستے مورچہ بند کر دیتے۔ پھر دفاعی مورچہ بندی کر دی گئی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سکھ لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالاکوٹ سے تین میل دُور خیمہ زن تھا، وہ اسی طرف سے حملہ کر سکتا تھا لیکن یہ آسان نہ تھا کیونکہ بالاکوٹ مغربی کنارے پر واقع ہے۔ مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہُوئے بالاکوٹ کے سامنے سکھ پہنچ سکتے تھے لیکن مغرب کی طرف بالاکوٹ کے محاذ پر آنا اُن کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ راستے میں دشوار گزار پہاڑ حائل تھے۔

بالاکوٹ ایک محفوظ مقام ہونے کے متعلق سیّد احمد شہید نے ۲۵ اپریل ۱۸۳۱ء کے روز (شہادت سے گیارہ روز پہلے) نواب محمد وزیر خان ولی عہد ٹانک کو خط لکھا۔ یہ اُن کا آخری خط تھا۔ انہوں نے اہلِ سمہ کے جور و ستم اور پھر ہجرت کی تفصیل کے بعد لکھا ــــ "ہمیں پچھلی پہاڑوں پر آ گیا ہوں۔ یہاں کے باشندے حسنِ اخلاق سے پیش آتے اور جہاد میں اعانت کے پختہ وعدے کئے۔ ہمیں قیام کے لئے جگہ دی۔ فی الحال قصبہ بالاکوٹ میں اطمینان سے ٹھہرا ہُوا ہوں۔ کفّار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے ہُوئے ہے۔ یہ مقام محفوظ ہے۔ خدا کے فضل سے اُن کا لشکر یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر مجاہدین پیش قدمی کریں تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ چند دنوں کے بعد جنگ کی جائے۔ بارگاہِ باری تعالیٰ سے اُمید ہے کہ فتح و نصرت کے

دروازے کھُل جائیں گے۔ اگر تائیدِ ربانی شاملِ حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہُوئے تو انشاء اللہ دریائے جہلم سے کشمیر کے آخری سرے تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکرِ مجاہدین کی کامیابی کی دُعا کرتے رہیں۔"

سکھوں کو اس جنگ میں فتح کا یقین نہ تھا۔ پنجاب کے پولیٹیکل اسسٹنٹ سی۔ ایم۔ وُیدے نے گورنر جنرل کے سیکرٹری ایچ۔ پی۔ پرنسیپ کو لکھا تھا ــــ "میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری نامہ نگار کی رپورٹ کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ کنور شیر سنگھ اور بھمن سنگھ گورنر کشمیر کی طرف سے اطلاعات پہنچی ہیں کہ یہ خبر پا کر کہ سیّد احمد شہید دربہ کے مقام پر ہیں جو پہاڑوں کے اندر بہت ہی محفوظ جگہ ہے، انہوں نے کوچ کیا اور جنگ کا آغاز کر دیا۔ سرکاری فوج چونکہ پہاڑوں کے اندر محفوظ مقامات اور درّوں وغیرہ سے واقف نہیں تھی اس لئے بُری طرح شکست کھا گئی۔ تین سَو سکھ مارے گئے اور اتنے ہی زخمی ہُوئے۔ انہیں جب یقین ہو گیا کہ جنگ جاری رکھنا ناممکن ہے تو سکھ فوج چھ سات کوس پیچھے ہٹ آئی اور خیمہ زن ہو گئی۔ ان کا ارادہ جلد دوبارہ حملہ کرنے کا تھا لیکن اُن کے کیمپ کے اندر گندم قلّت کی وجہ سے بہت مہنگی ہو گئی تھی اور ایک روپے کی پانچ سیر ملتی تھی۔"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس شکست کی اطلاع ملی تو اپنے جوتشی سنکرن اور مدسودن کو بلایا اور تمام واقعہ ان کو سُنا کر کہا کہ حساب لگا کر بتائیں کہ کنور شیر سنگھ کامیاب ہو گا یا نہیں۔ انہوں نے حساب لگا کر جواب دیا کہ اچھی طرح سوچ کر اور ایک بار پھر دیکھ کر بتائیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فتح یقینی اور آسان نہیں۔

مغرب کی طرف جو دشوار گزار پہاڑ حائل تھا اس پر پرانے حملہ آوروں اور بادشاہوں نے فوجوں کے لئے ایک راستہ بنایا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر گھاس اور جھاڑیاں اُگیں اور راستہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں کے چند ایک باشندوں کو اس راستے کا علم تھا۔ سکھ راستے سے بالکل ہی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بے خبر تھے۔ وہاں آبادی بہت ہی کم تھی، اس لئے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ پوشیدہ راستہ پہاڑ کے دوسری طرف تھا۔ یعنی بالاکوٹ کی طرف سے اس پر نقل و حرکت کی خبر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ایک پہاڑی نالے کا بہاؤ تھا جو اُوپر جا کر پگڈنڈی بن گئی تھی۔ شیر سنگھ بالاکوٹ کی تسخیر کو ناممکن سمجھ کر لاہور واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس موقع پر چند ایک ایمان فروشوں نے انعام و اکرام کے عوض غداری کی اور سکھوں کو یہ راستہ بتا دیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے اور تمام راستہ اچھی طرح دکھا دیا۔ شیر سنگھ کی مایوسی مسرت میں بدل گئی اور واپسی ترک کر دی اور اس راستے پر کوچ کر دیا۔ یہ بالاکوٹ کی طرف پیشقدمی تھی۔ مجاہدین یہ سمجھے کہ سکھ واپس جا رہے ہیں۔ سکھوں کی نقل و حرکت رات کو ہوتی تھی۔ انہوں نے توپیں اور شاہنیں بھی ضرورت کے مقام پر پہنچا دیں۔

سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ پہلے مُلّا لال محمد قندھاری کو جس مورچے میں مقرر کیا گیا تھا وہاں سردی بہت ہی زیادہ تھی۔ اس کی جگہ دوسرا جیش بھیجا گیا جس کی کمان مرزا احمد بیگ کے ہاتھ تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اس پوشیدہ راستے کا دہانہ آ کر کھلتا تھا۔ سکھوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک رات کے پچھلے پہر انہوں نے اچانک مرزا لال بیگ کے مورچے پر حملہ کر دیا۔ دشمن کی تعداد کی افراط کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مرزا اور اس کے مجاہدین نے جم کر مقابلہ کیا۔ اُس نے ایک قاصد سیّد احمد شہید کو اطلاع دینے کے لئے بھیج دیا۔ سکھوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ آٹھ مجاہدین شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے تو مرزا احمد بیگ بچے کھچے چند ایک مجاہدین کو ساتھ لے کر مورچہ چھوڑ آئے۔ سکھوں نے دہانے پر قبضہ کر لیا۔

سیّد احمد شہید نے اطلاع ملتے ہی ایک جیش اُن کی مدد کے لئے بھیجا۔ دو سو مجاہدین مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہ ٹیلہ پہاڑ کے دامن اور بالاکوٹ کے درمیان واقع تھا۔ سکھ اس قدر زیادہ تعداد میں تھے کہ مجاہدین کے لئے مزید پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ سکھوں کو غداروں نے ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جس کے دہانے پر وہ پہنچے تو آگے انہیں کئی راستے مل گئے۔ مجاہدین بڑی

ہی قلیل نفری سے خونریز معرکے لڑے مگر سکھوں کو پیچھے نہ ہٹا سکے۔ سکھوں نے دریا کے مغربی کنارے پر بھی قدم جما لئے تھے۔ وہ مشرقی کنارے پر بھی تھے۔ مجاہدین نے پُل توڑ دیا۔ پھر بھی سکھوں کی پیشقدمی نہ روکی جا سکی کیونکہ ان کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ مسجد کلاں کے اردگرد تختوں سے مورچہ بندی کر لی گئی۔

سیّد احمد شہید نے مُلّا لال قندھاری سے دریافت کیا — "کیا یہ ممکن ہے کہ ست بیٹے کے نالے ہو کر پہاڑ پر جائیں اور سکھوں پر شبخون ماریں؟" — مُلّا نے جواب دیا — "مدت سے اس ملک میں رہ کر لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا۔ ان سے نفاق دُور کرنا مشکل ہے۔ یہی لوگ سکھوں کو راستہ دکھا کر لائے ہیں۔"

"آپ نے دُرست کہا" — سیّد احمد شہید نے — "ہم نے اس کارِ خیر میں کوتاہی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہندوستان، خراسان، ترکستان میں اپنے نمائندے بھیجے۔ ہر جگہ دعوتِ جہاد پہنچائی۔ جہاں خود گئے وہاں وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ بہتر یہی ہے کہ اب سب مورچوں سے بھائیوں (مجاہدین) کو بلا لیں۔ کل صبح اس بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہوگا۔ اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو ان پر فتح یاب کیا تو لاہور دیکھیں گے، شہید ہوئے تو جنت الفردوس۔"

✸

جنگ کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ مٹی کوٹ سے اُتر کر ٹیلے اور قصبے کے دریائی نشیب میں جب سکھ پہنچیں تو اُن پر حملہ کر دیا جائے۔ اس نشیب میں زیادہ تر دھان کے کھیت تھے۔ ایک دو دن پہلے بارش ہو جانے سے زمین دلدل بن گئی تھی اور گزرنے کے قابل نہیں رہی تھی.... مجاہدین نے حسبِ دستور صبح کی نماز باجماعت ادا کی۔ سیّد احمد شہید نے اپنی مُہر منشی محمدی انصاری کے حوالے کر دی، اور سب مجاہدین جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ سورج نکل آیا تو سکھ مٹی کوٹ کے شمالی گوشے پر نمودار ہوئے۔ اُن کی بندوقوں کی گولیاں اور توپوں کے گولے مسجدِ بالا کے اردگرد پڑ رہے تھے۔ سیّد احمد شہید نے تمام

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سرداروں کو تاکید کر دی تھی کہ سب مورچوں میں بیٹھے گولیاں چلاتے رہیں لیکن باہر نکل کر اُس وقت تک حملہ نہ کریں جب تک ہمارا دُشمن آگے بڑھتا ہُوا نظر نہ آئے۔ کچھ وقت بعد سیّد احمد شہید بالاخانی مسجد سے کُود کر مع اپنی جماعت کے نیچے والی مسجد میں جہاں ایک جماعت پہلے سے مورچہ بندی کر کے دُشمن کو روکنے کے لئے مستعد ہو چکی تھی، آ گئے۔ دُشمن ابھی دلدل کو پوری طرح عبُور نہ کر سکا تھا مگر بستی کے اس قدر قریب آ چکا تھا کہ اُس کی گولیاں مسجد میں پہنچ کر نقصان پہنچانے لگی تھیں۔ سیّد احمد شہید مسجد سے نکل کر دلدل کے کنارے پر جا پہنچے۔ اب دونوں لشکروں کے درمیان دھان کے کھیت اور دلدل حائل تھی۔

سکھوں نے مجاہدین پر گولیوں کی بارش تیز کر دی اور خطرہ پیدا کر دیا کہ تمام مجاہدین اُن کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ البتہ قندھاریوں کی ایک جماعت دامنِ کوہ سے دُشمن کے میمنہ پر حملہ کر رہی تھی۔ اس جماعت نے زیادہ مجاہدین کی کمک کی درخواست کی کیونکہ اس وقت اُن کا زور بہت زیادہ تھا لیکن اُن کو مدد پہنچانا ممکن نہ تھا۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو آمنے سامنے کی جنگ تھی۔ سیّد احمد شہید بسم اللہ۔ اللہ اکبر کہہ کر دلدل میں کُود پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلدل سے پار ہو گئے۔ مجاہدین نے اپنے قائد کی یہ جرأت دیکھی تو سب دلدل میں داخل ہو گئے اور پار جا کر اپنے قائد سے جا ملے۔ دست بدست معرکہ شروع ہو گیا۔ مجاہدین کے قہر کا یہ عالم تھا کہ انتہائی قلیل تعداد کے باوجود دُشمن کے پاؤں اکھاڑ دیتے۔ سکھوں کو ہلاک اور زخمی کرتے اُسے پہاڑ تک پہنچا دیا مگر پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا اور مجاہدین پر دوسری ہمتوں سے بندوقوں کی گولیاں اور توپوں کے گولے مسلسل آ رہے تھے۔ سکھوں کے پاس نفری اور جنگی قوّت کی افراط تھی۔ مشرقی کنارے پر سکھوں کا جو توپخانہ تھا وہاں سے بھی گولہ باری ہو رہی تھی۔ اس طرح مجاہدین پر تین طرف سے آگ برس رہی تھی۔ دریائے کنہار کے مشرقی

کنارے سے، مغربی کنارے سے اور پہاڑ کی بلندی سے۔ فضا کا یہ عالم تھا کہ گولوں کے دھوئیں سے پُر تھی۔ کچھ دیکھنا اور پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ سکھ اندھا دُھند گولیاں اور گولے چلا رہے تھے جن سے کئی سکھ بھی ہلاک ہو گئے۔ مجاہدین کے دم میں جب تک دم رہا وہ جواب دیتے رہے۔ آخر سب شہید ہو گئے اور میدانِ جنگ پر خاموشی طاری ہو گئی۔

مولوی جعفر علی نقوی جو سیّد احمد شہید کے محافظوں میں سے تھے، لکھتے ہیں ــــ "جناب حضرت امیر المومنین در ہمہ جماعت از نظرِ من غائب شُد۔"

یہ سانحہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ بمطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ ہُوا۔ معلوم ہُوا کہ سیّد احمد شہید کو توپ کا گولہ سیدھا آ کر لگا جس سے آپ کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔ بہت سے مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا اور میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔ سکھوں نے بالاکوٹ پہنچ کر خوب لُوٹ مار کی معصوم آبادی کا قتلِ عام کیا۔ قصبے کو آگ لگا دی اور اس آگ میں اپنے مرے ہُوئے سکھوں کی لاشیں جلا دیں۔ سکھوں کا لشکر وہاں چار روز مقیم رہا پھر اسے واپس بلا لیا گیا۔ ایچ۔ پی۔ پرنسیپ کے ایک خط کا اقتباس جو ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء کے روز لکھا گیا تھا یوں ہے ــــ "کنور شیر سنگھ کی طرف سے ایک ایلچی پہنچا۔ اُس نے بیان کیا کہ سیّد احمد شہید نے تین چار ہزار لشکریوں کے ساتھ جو زیادہ تر ملک کے کسانوں پر مشتمل تھا نالے کے پار بالاکوٹ میں اڈہ جما لیا تھا۔ کنور شیر سنگھ نے دوپہر کے وقت پیشقدمی شروع کر دی اور اس علاقے کے زمیندار (خان خوانین) میری (شیر سنگھ کی) مدد کے لئے ساتھ تھے۔ پرتاپ سنگھ اٹاری والے کی فوج، رتن سنگھ گھڑ چکی اور دوسرے سرداروں کی فوجیں بھی ساتھ تھیں جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔ اس لشکر نے نالے کو پا پیادہ پار کیا اور دُشمن (مجاہدین) کو بے خبری میں جا لیا اور اُن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اب تلواروں سے دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ سیّد احمد بمع اپنے پانچ سو ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔ ان

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے خیموں اور سامان پر قبضہ کر لیا گیا۔ باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔"

یہاں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انگریز بھی مسلمانوں کا دشمن تھا اور سکھوں کی پُشت پناہی کر رہا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی فتح کی خبر سُن کر اس قدر خوش ہُوا کہ اطلاع لانے والے کو سونے کا ایک ہار انعام دیا۔ ایک پگڑی دی اور دو شالیں۔ گوبند گڑھ کے گورنر فقیر امام دین کو حکم دیا کہ اس قلعے میں جتنی توپیں موجود ہیں انہیں باری باری گیارہ بار داغا جائے۔

شکست مکمل تھی اور کچھ وقت کے لئے مجاہدین کی تمام اُمیدیں خاک میں مِل گئیں۔ سیّد احمد شہید کے جسم کے متعلق کئی باتیں بنائی گئیں اور ہر ایک جماعت نے اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ ان کی قبر بالاکوٹ میں بنائی گئی لیکن یہ معتقدین کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے ہے ورنہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ بعد میں ایک گروہ نے اس قبر کو زائرین سے پیسے بٹورنے کا ذریعہ بنا لیا۔ ایک کٹّر مسلمان جماعت نے سکھوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے مشہور کیا کہ سکھوں نے سیّد احمد شہید کی لاش جلا دی تھی۔ سکھوں نے اپنی نجیب فوج کو تسلّی کے لئے اور فقیر خاندان کی فقیری کو برقرار اور اپنے زیر رکھنے کے لئے مشہور کیا کہ سیّد احمد شہید کی لاش کو دو شالوں میں لپیٹ کر پورے احترام سے دفنایا گیا تھا۔ سکھوں نے اُن کی تصویر بنائی اور ان کے تقویٰ اور شجاعت کے تذکروں سے دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے، لیکن حق بات تو وہی ہے جو اُن کے محافظ مولوی جعفر علی نقوی نے کہی تھی کہ وہ یک بیک غائب ہو گئے۔ یہی صحیح ہے کہ توپ کا گولہ براہِ راست لگنے سے اُن کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے اور معلوم نہ ہو سکا کہ دفعتہً کہاں گئے۔ البتہ رنجیت سنگھ ان کی شہادت کی خبر سے بہت خوش ہُوا کیونکہ اُس کی حکومت کے لئے مجاہدین بڑی مصیبتوں کا باعث بنے ہُوئے تھے۔

سیّد محمد اسمٰعیل اور بہرام خان کی لاشوں کو وہاں کے باشندوں

نے دفن کر دیا تھا۔ جو مجاہدین اس معرکے میں حصّہ نہ لے سکے تھے یا جو اس میں زخمی ہُوتے تھے اور جو زندہ رہے اُن کی تعداد ایک سَو پچاس بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے مولوی نصیر الدّین کو اپنا امیر مقرر کیا اور سیّد اکبر شاہ کے ہاں ستھانہ چلے گئے۔ یہ لوگ تارک الدنیا اور مجاہدین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ پٹھانوں میں سے جن قبائل نے اس جہاد میں حصّہ لیا وہ یوسف زئی اور خٹک تھے جنہوں نے بہادری اور بے پناہ قربانیوں سے رنجیت سنگھ کی قوّت کو پیر سبک کی جنگ میں اُدھ موا کر دیا تھا۔

افراد کی کامیابی یہ ہے کہ وہ دُنیا میں اپنا کام کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں۔ مقصد کے لئے اگر رہروانِ سفر جذبۂ ایثار کے ساتھ سفر طے کرتے رہیں تو منزل مِل ہی جاتی ہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حسین ناگن

سکندرِ اعظم تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُسے فاتح کی حیثیت سے ایسی شہرت ملی کہ اُسے کئی ایک روایات اور حکایات کا کردار بنالیا گیا۔ ان میں زیادہ مشہور یہ حکایت ہے کہ سکندرِ اعظم مرنے لگا تو اُس نے وصیت کی کہ میں مرجاؤں تو میرے ہاتھ تابوت سے باہر رکھنا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم کرکے عبرت حاصل ہو کہ کئی ملک فتح کرنے کے باوجود میں دُنیا سے خالی ہاتھ جارہا ہوں۔

اگر اُس کی ماں اولمپیاس صرف روائتی ملکہ ہوتی تو سکندر دُنیا سے خالی ہاتھ بھی جاتا اور دُنیا میں کوئی اُس کے نام سے واقف بھی نہ ہوتا۔ صرف اُس کے ملک کے لوگ چند دن یاد رکھتے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد مرگیا ہے۔ سکندر کو بادشاہ اُس کی ماں اولمپیاس نے بنایا تھا اور اس مقصد کے لیے مقدونیہ کی اس غیر معمولی طور پر حسین عورت کو متعدّد آدمی پُراسرار طریقوں سے قتل کرانے پڑے تھے۔ یہاں تک کہ اس عورت نے اپنے خاوند فلیقوس (سکندر کے باپ) کو بھی قتل کرادیا تھا۔

وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ سکندر فاتح تو دُور کی بات ہے، بادشاہ بننے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وہ شرمیلا لڑکا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ توانا تھا اور خوبرو بھی لیکن ذہنی لحاظ سے اُس میں مستعدی اور چستی تھی ہی نہیں۔ وہ جوان ہوگیا تو بھی اُس میں کوئی بہتر تبدیلی نہ آئی۔ اُسے صرف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گھوڑوں کے ساتھ دلچسپی تھی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اُسے باپ کے مرنے کے بعد مقدونیہ کا تخت و تاج سنبھالنا تھا مگر باپ اُس کی عادات سے پریشان رہتا تھا۔ ایک روز ایران کا سفیر اپنے محافظ گھوڑ سوار دستے کے ساتھ شاہ فیلقوس سے ملنے مقدونیہ آیا۔ یہ دوستانہ دورہ تھا۔ ایرانی سفیر ایران کے بادشاہ کی طرف سے بیش قیمت تحفے لایا تھا۔ سفیر محل کے قریب پہنچ گیا۔ سکندر کی ماں اولمپیاس نے سکندر کی تربیت کے لیے اُس کے دوست بطلیموس سے کہا کہ سکندر جہاں کہیں ہے اُسے کہو کہ ایران کے سفیر کا استقبال اُس طریقے سے کرے جس طرح اُسے سکھایا گیا تھا۔

سکندر باہر ہی کھڑا تھا۔ ایرانی سفیر محل کے دروازے پر آکر رُک گیا کہ کوئی اُس کے استقبال کو آئے۔ سفیر نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے محافظ دستے کے گھوڑے اعلیٰ نسل کے تھے۔ سکندر کو بطلیموس نے کہا کہ ملکہ نے کہا ہے کہ اپنے باپ کی جگہ سفیر کا استقبال کرو۔ سکندر نے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ وہ محافظوں کے گھوڑوں کو اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ سفیر گھوڑے سے اُترا تو محافظ بھی اُتر آئے۔ سکندر کو یہ گھوڑے اتنے اچھے لگے کہ وہ ایک گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ سکندر کا لباس معمولی سا تھا۔ محافظوں نے اُسے محل کا ملازم سمجھا اور اُسے ڈانٹ کر کہا کہ وہ گھوڑے سے اُتر جائے۔

کسی نے انہیں بتایا کہ یہ شاہ فیلقوس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ایرانی سفیر نے اُس کی تعظیم کی اور سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسے کہا کہ اُسے جو گھوڑا پسند ہے اُس پر سوار ہو جائے مگر ایرانی سفیر کے چہرے پر مایوسی اور ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ سکندر کے ہم عمر دوست بطلیموس نے سکندر کے کان میں کہا کہ وہ مہمان اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں کو دستور کے مطابق شراب پیش کرے مگر سکندر نے ایرانی سفیر کے ساتھ گھوڑوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُسے اندر چلنے کو بھی نہ کہا۔ شاہ فیلقوس تخت پر بیٹھا مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ ایک سفیر کے استقبال کے لیے باہر نہیں آسکتا تھا۔

ملکہ اولمپیاس اپنے بیٹے کی عادتوں اور ذہنی رجحان سے واقف تھی۔ اُس نے دریچے سے باہر جھانکا۔ سکندر ایرانی سفیر کو روکے کھڑا تھا اور کُند ذہن اور کھلنڈرے لڑکوں کی طرح بیکار کنکروں میں لگا ہُوا تھا۔ اولمپیاس یہ سوچ کر خود باہر آئی کہ شاہ فیلقوس کو پتہ چل گیا کہ اُس کا بیٹا سفارتی آداب کو نظر انداز کر رہا ہے تو وہ بگڑ جائے گا۔

ایرانی سفیر، اُس کے ساتھ آیا ہُوا وفد اور محافظ اتنی حسین ملکہ کو دیکھ کر سُن ہو کے رہ گئے۔ نسوانی حسن کے لیے ایران بھی مشہور تھا مگر یونانی حُسن نے اُن پر طلسم طاری کر دیا۔ وہ اُس کے بیٹے کا گنوارپن بھول گئے۔ اولمپیاس نے دستور کے مطابق سفیر کا استقبال کیا اور اُسے دیگر مہمانوں کے ساتھ اندر لے گئی۔ اولمپیاس نے سکندر کے کان میں کہا کہ مہمانوں کو شراب پیش کرو۔ سکندر نے ایسے انداز سے شراب پیش کی جو بالکل عامیانہ تھا۔ وہ اس شاہی رسم سے واقف ہی نہیں تھا۔ ایرانی سفیر نے شراب قبول نہ کی اور کہا کہ وہ سادہ پانی پیے گا۔ یہ ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔

مہمانوں کو شاہ فیلقوس کے دربار میں پیش کر کے اولمپیاس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے سکندر کو وہاں بلایا اور اُسے خوب ڈانٹا۔ اُس نے کہا — "تمہیں اپنے باپ کی جگہ بادشاہ بننا ہے مگر تم تو جیسے گونگے اور بہرے ہو۔ لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھوڑے ایسے سمائے ہیں کہ تمہیں کسی اور چیز کے ساتھ دلچسپی ہی نہیں۔ تمہارا دادا گھوڑوں کا سوداگر تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پر دادا کی بدرُوح سوار ہے.... اپنے آپ کو اس بادشاہی کے قابل بناؤ۔"

سکندر کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے ماں کی باتوں نے تکلیف دی ہے۔ اُسے تخت و تاج کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ اُس نے کبھی سوچا تھا کہ وہ بادشاہ بن کر دُوسرے ملکوں پر فوج کشی کرے گا مگر اُس کی ماں اُسے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تخت کے لیے تیار کر رہی تھی۔ یہ ایک جنون تھا جو یونان کی اس انتہائی حسین عورت کے دماغ پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ یہ جنون سکندر کی پیدائش سے پہلے کا تھا۔ اولمپیاس اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ ایک بیٹے کو جنم دے گی جو مقدونیہ کا بادشاہ ہو گا۔ وہ قبل مسیح کا دور تھا جب انسان توہم پرست تھا۔ یونان نے تو خیالی دیوتا تخلیق کر رکھے تھے۔

اولمپیاس کے خیالات اور عقیدے بھی ایسے ہی تھے۔ اُس نے بہت سے سانپ پالنے شروع کر دیئے اور محل کا ایک حصّہ سانپوں کے لیے وقف کر دیا۔ انہیں وہ اپنے ہاتھوں دُودھ پلاتی اور خوراک کھلاتی تھی۔ محل کے اس حصّے کے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرتا تھا لیکن اولمپیاس ان رینگتے ہوئے سانپوں میں گھومتی پھرتی تھی۔ کمروں میں، برآمدوں اور غلام گردشوں میں سانپ رینگتے پھرتے یا کنڈلی مارے سو رہے ہوتے تھے۔ ملحقہ باغیچے میں پودوں کی بیلوں کے ساتھ سانپ لپٹے ہوتے تھے۔ یہاں سے کوئی سانپ بھاگ کر کہیں جاتا نہیں تھا کیونکہ یہاں انہیں بڑی اچھی خوراک ملتی تھی۔ اولمپیاس نے سُن رکھا تھا کہ پیٹ میں بچّہ ہو تو وہ اُس ماحول سے متاثر ہوتا ہے جس میں اُس کی ماں رہتی ہو۔ چنانچہ اولمپیاس نے اپنے ماحول کو سانپوں سے بھر دیا۔ وہ اپنے ہونے والے بچّے میں سانپوں والی خصلتیں پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ یہ کہ جس طرح وہ خود اتنے زہریلے اور خطرناک سانپوں میں بے خوف گھومتی پھرتی رہتی ہے، اسی طرح اس کا ہونے والا بچّہ بھی نڈر ہو گا۔ اس عورت نے اپنے آپ کو نڈر بنا لیا تھا۔ سانپ پالنے اور ان میں رہنے کی وجہ سے وہ "حسین ناگن" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اولمپیاس کا خاوند فیلقوس اس کے بے مثال حُسن سے متاثر ہُوا اور اس کے ساتھ شادی کر بیٹھا تھا۔ شادی کے بعد اُس نے دیکھا کہ اس جوان لڑکی کی خوبصورتی طلسم ہوش ربا ہے اور پُراسرار بھی۔ اُس کا ذہن سازش ساز تھا مگر اس کا جو طلسم فیلقوس پر طاری ہو چکا تھا، اُس کے آگے

وہ مسحور کیے ہوئے انسان کی طرح بے بس اور مجبور تھا۔ وہ اُسے آدھے محل کو سانپوں سے بھر دینے سے بھی نہ روک سکا۔ جونہی اولمپیاس دیکھتی تھی کہ اُس کا خاوند اُس کی کسی حرکت سے پریشان ہو رہا ہے تو وہ اپنے حُسن اور زبان سے اُسے مسحور کر لیتی تھی۔

پھر سکندر پیدا ہُوا۔ اولمپیاس نے ایک ایک کر کے تمام سانپوں کو مار ڈالا لیکن لوگ اُسے "حسین ناگن" ہی کہتے رہے۔ سکندر کا شعور بیدار ہُوا۔ وہ باتیں کرنے اور سمجھنے لگا تو اولمپیاس نے دو چار عورتیں اور چند ایک آدمی انعام و اکرام اور اُجرت پر رکھ لیے جنہیں اُس نے کہا کہ وہ اُس کے بچّے کے کان میں ہر وقت یہ ڈالتے رہا کریں کہ وہ عظیم آدمی بنے گا اور وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہو گا۔ اولمپیاس نے ان عورتوں اور آدمیوں کو یہ فرض بھی سونپا کہ وہ اُسے بتاتے رہا کریں کہ بچّہ ان کے ساتھ کیا باتیں کرتا ہے اور اُس کا ذہن اُسے کس طرف لے جا رہا ہے۔

فیلقوس نے دیکھا کہ اُس کے بچّے کو ماں نے اپنا قیدی بنا لیا ہے اور اُس کے ذہن کو کسی خاص سانچے میں ڈھال رہی ہے تو اُسے فکر پیدا ہُوا کہ بچّے کی ماں بچّے کو اپنے جیسا پُراسرار فتنہ بنا رہی ہے اور اگر بچّے کا ذہن ماں کی خصلت کے سانچے میں ڈھل گیا تو یہ مقدونیہ کے تخت و تاج کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ چنانچہ اُس نے بچّے کو ماں سے الگ کرنے کے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے مگر بچّہ باپ کے پاس جاتا تو ماں بھی جا پہنچتی اور بچّے کو باپ کے اثر سے محفوظ رکھتی۔ باپ کو بچّے کے ساتھ اتنا ہی پیار تھا جتنا ماں کو تھا۔

باپ آخر باپ تھا، مرد تھا اور بادشاہ بھی تھا۔ اُس نے سکندر کو اُس عبادت گاہ میں بھیج دیا جہاں استادِ زماں ارسطو طبّ اور حکمت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ یہ عبادت گاہ شہر سے دس گیارہ میل دُور تھی۔ ارسطو نے شاگردوں کو تعلیم دینے کے لیے یہ عبادت گاہ اس لیے پسند کی تھی کہ شہر کے ہنگاموں سے دُور تھی اور وہاں عبادت کے لیے کوئی نہیں جاتا تھا کیونکہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یہ عبادت گاہ ویران ہوگئی تھی۔ ارسطو کو جو سکون وہاں میسر تھا وہ کسی محل میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ سکندر کو تعلیم کے لیے باپ نے وہاں بھیج دیا۔ ماں اُسے روک نہیں سکتی تھی۔ بچے کو تعلیم تو دینی ہی تھی، لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ وہ بچے کو کوئی اور تعلیم دینا چاہتی تھی۔

دو تین ماہ بعد مقدونیہ کے ایک سرحدی قبیلے نے بغاوت کر دی۔ شاہ فیلقوس فوج لے کر بغاوت کو کچلنے کے لیے چلا گیا۔ اولمپیاس کو موقع مل گیا۔ وہ ایک رات کسی کو بتائے بغیر اس ویران عبادت گاہ میں چلی گئی جہاں اُس کا بیٹا ارسطو کے پاس پڑھتا اور وہیں رہتا تھا۔ وہ ارسطو سے تنہائی میں ملی اور اس عظیم فلسفی اور مفکر پر ایسا جادو چلایا کہ وہ اس عورت کی بات مان گیا۔ اولمپیاس نے اُسے کہا تھا کہ اُس کے بچے کو وہ فیلقوس کی خواہش کے مطابق فلسفے اور طب کی تعلیم نہ دے بلکہ اسے بہترین حکمران اور سیاست دان بننے کے جوہر بتا دے۔ ارسطو نے سکندر کو وہی تعلیم دی جو اُس کی ماں نے تجویز کی تھی۔

سکندر سولہ سال کی عمر میں تعلیم لے کر عبادت گاہ سے واپس آ گیا۔ اُس میں جہاں اور تبدیلیاں آئیں وہاں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ وہ ارسطو کو دُنیا کا عظیم انسان اور قابلِ احترام اتالیق ماننے لگا مگر اُس کی تمام تر دلچسپیاں گھوڑوں کے ساتھ وابستہ ہوگئیں۔ حکومت اور سیاست کے گُر جاننے کے باوجود اُس نے ادھر توجہ نہ دی کہ اُسے باپ کا جانشین بننا ہے۔ اس کی ماں بہرحال خوش تھی کہ اُس کے بیٹے نے ماں کے عزائم اور خواہشات کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کر لی تھی، لیکن ماں اسی سے مطمئن نہ تھی۔ وہ سکندر کو تمام انسانوں سے بلند و برتر بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ اس کا اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے محل کی خادماؤں کو بڑی ہی رازداری سے بتایا کہ سکندر اُس کے خاوند فیلقوس کا بیٹا نہیں بلکہ وہ ایک دیوتا شنر خاف کا بیٹا ہے جو ایک خوبصورت اور زہریلے ناگ کے رُوپ میں اُس کے پاس آیا تھا۔

اُس زمانے میں یونان کے لوگ دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے اور وہ اس افسانوی مفروضے کو بھی سچ مانتے تھے کہ کسی دیوتا کو کوئی عورت پسند آجاتی ہے تو وہ اُسے اپنے پاس بلا لیتا ہے یا کسی دُنیاوی رُوپ میں اُس کے پاس آجاتا ہے۔ یونان کی دیومالائی داستانوں میں دُنیا کی عورتوں کے ساتھ دیوتاؤں کے عشق و محبت کی کئی داستانیں ملتی ہیں۔

اولمپیاس نے سکندر کے متعلق یہ مشہور کیا کہ وہ دیوتا کا بیٹا ہے تو سننے والوں کو فوراً یقین آگیا۔ اولمپیاس نے یہ بات اپنی خادماؤں کو رازداری سے اس لیے بتائی تھی کہ عورت بات پھیلانے کی عادی ہوتی ہے۔ چند دنوں میں سارے ملک میں مشہور ہوگیا کہ سکندر فیلقوس کا نہیں دیوتا شنر خاف کا بیٹا ہے۔

فیلقوس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کی بیوی اپنے بیٹے کو مافوق الفطرت انسان کے رُوپ میں پیش کر رہی ہے اور اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عورت فیلقوس کی زندگی میں اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کرے۔ فیلقوس کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اُس نے سکندر کو ارسطو کے پاس جس تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا تھا اس کی بجائے وہ کوئی اور تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور یہ اس کی ماں کے کہنے پر عمل ہُوا ہے۔ فیلقوس نے اپنے بیٹے کو ماں کے بداثرات سے بچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ یہ مشہور کر کے کہ سمندر کی طرف سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے، اپنی فوج کو لے کر سمندر کی طرف چلا گیا اور سکندر کو بھی جنگی تربیت دینے کے بہانے ساتھ لے گیا۔

فوج کو سمندر کے کنارے خیمہ زن کر دیا اور فیلقوس اپنے بیٹے کا مشاہدہ کرنے لگا کہ اس کا ذہن کس طرف جا رہا ہے۔ ایک قلوپطرہ مصر کی ملکہ تھی جو فرعونوں کے خاندان سے تھی۔ ایک قلوپطرہ یونان کی بھی تھی جس کے حُسن کے چرچے دُور دُور تک تھے۔ فیلقوس کی فوج سمندر کے کنارے خیمہ زن تھی۔ ایک رات فیلقوس اپنے خیمے میں شراب سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دل بہلا رہا تھا۔ خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جس کی خوبصورتی ارضی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ فیلقوس کو معلوم ہُوا کہ وہ شراب کچھ زیادہ پی گیا ہے جس کے اثر سے اُسے اتنے حسین واہمے نظر آنے لگے ہیں۔

قلوپطرہ اُس کے پہلو میں جا بیٹھی۔ فیلقوس نے اُس کے جسم کو محسوس کیا تو اُسے یقین آیا کہ یہ واہمہ نہیں، گوشت پوست کی عورت ہے... تھوڑی ہی دیر بعد فیلقوس نے فوج کو خیموں سے نکال کر شراب کے مٹکے کھول دیئے اور اعلان کیا کہ آج فوج جشن منائے گی۔ صبح تک سپاہی ناچتے گاتے اور شراب پیتے رہے۔ فیلقوس نے قلوپطرہ کو اپنے خیمے میں رکھا۔ دن کو جب فیلقوس کو ہوش آیا تو اُس نے سکندر سے کہا کہ تم میرے قائم مقام بادشاہ ہو۔ واپس چلے جاؤ اور میری واپسی تک حکومت کا کاروبار چلاؤ۔

سکندر چلا گیا۔ چھ ماہ تک فیلقوس اپنی فوج کے ساتھ سمندر کے کنارے رہا اور قلوپطرہ کو اُس نے اپنے ساتھ رکھا۔ ایک روز فیلقوس کا ایک قاصد رازداری سے سکندر کے پاس گیا اور اُسے باپ کا یہ پیغام دیا — "میرے عزیز بیٹے! میں نے اطالوس کی بھتیجی قلوپطرہ کے ساتھ شادی کرلی ہے اور تمہاری ماں کو میں اب اپنی بیوی نہیں سمجھتا۔ میں نے تمہاری بہتری کی خاطر تمہاری ماں سے قطع تعلق کیا ہے۔ تم تخت کے وارث ہو۔ تمہیں اپنی ماں کا افسوس نہیں ہونا چاہیئے۔"

سکندر اس خفیہ پیغام کو اپنی ماں سے چھپا نہ سکا۔ اولمپیاس کے لیے یہ ضرب بڑی سخت تھی لیکن اُس نے نہ احتجاج کیا نہ کسی ردِّعمل کا اظہار کیا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ لے جانا چاہتی بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا بیٹا مقدونیہ کے تخت کا وارث تھا۔ اولمپیاس نے یہ عجیب و غریب حرکت کی کہ شہر سے ذرا ہی دُور ایک پرانا قبرستان تھا جس کے درمیان ایک بہت پرانا جھونپڑا کھڑا تھا۔ اولمپیاس محل اور اپنے بیٹے کو خیرباد کہہ کر اس جھونپڑے میں چلی گئی۔ وہاں وہ عبادت کرتی اور سُوت

کاتا کرتی۔

سکندر نے اپنے باپ کو پیغام بھیجا کہ ماں محل سے چلی گئی ہے اور اب قبرستان کے ایک جھونپڑے میں رہتی اور عبادت میں وقت گزارتی ہے۔ فیلقوس کو تو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ اولمپیاس محل سے نہیں نکلے گی اور اُس کا جینا حرام کر دے گی۔ وہ اپنے بیٹے کے پیغام سے بہت خوش ہُوا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ محل میں واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے مخبروں سے اولمپیاس کے متعلق معلوم کیا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتی ہے۔ مخبروں نے بتایا کہ وہ جھونپڑے میں بیٹھی رہتی ہے۔ اُسے شہر میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

فیلقوس کی نئی بیوی قلوپطرہ اُس کے ساتھ محل میں آ گئی۔ قلوپطرہ کا چچا اطالوس بھی ساتھ آیا اور محل میں رہنے لگا۔ فیلقوس نے سکون کا سانس لیا کہ ایک فتنہ پرور اور پُراسرار بیوی سے نجات ملی۔ فیلقوس یہ نہ دیکھ سکا کہ جس بیٹے کی خاطر اُس نے اولمپیاس کو طلاق دی ہے، وہ بیٹا قلوپطرہ اور اُس کے چچا کی نفرت کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ دونوں سکندر کو تخت کے نااہل، آوارہ اور کُند ذہن ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ بات ہی نہ کرتے۔ اگر کرتے بھی تو ان کی بات میں طنز اور حقارت ہوتی تھی۔ سکندر اُن کے رویّے اور نیّت کو بھانپ گیا۔ وہ اب بچّہ نہیں تھا مگر اُس کے باپ پر قلوپطرہ کے حسن کا جادو سوار تھا۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔

ایک رات محل میں بہت بڑی ضیافت تھی۔ سکندر بھی موجود تھا۔ شراب کا دَور چل رہا تھا مگر سکندر نہیں پی رہا تھا۔ قلوپطرہ اور اُس کے چچا جانتے تھے کہ سکندر شراب نہیں پیتا اور یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ سکندر کے خیالات کی پرواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ قلوپطرہ نے مہمانوں کے سامنے سکندر کو شراب پیش کی۔ سکندر نے انکار کر دیا۔

"تم اُجڈ اور جنگلی ہو" — قلوپطرہ کا چچا سکندر پر برس پڑا — "دیوتا زیوس کو قربانی دیتے ہو تو اُس کے بُت کے قدموں میں اپنے ہاتھوں شراب انڈیلتے ہو اور محفل میں کہتے ہو کہ تم شراب نہیں پیتے۔ کیا تم مقدونیہ کا بادشاہ بننے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے قابل ہو؟ نہیں، تم اس قابل نہیں ہو"۔ سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔ قلوپطرہ کے چچا نے شراب کے نشے میں یہ بھی کہہ دیا ۔"قلوپطرہ ایک بچے کو جنم دے گی اور وہ مقدونیہ کے تخت کا وارث ہوگا۔"

سکندر نے قریب پڑا ہُوا شراب کا ایک پیالہ اٹھایا اور اطالوس (قلوپطرہ کے چچا) کے سر پر پوری طاقت سے مارا۔ اطالوس چکرا کر گرا۔

قلوپطرہ دوڑی آئی۔ سکندر نے اُس کے مُنہ پر بھرپور تھپڑ مارا۔ وہ بھی تیورا کر گری۔ محفل پر سناٹا طاری ہوگیا۔ سکندر کا باپ غصّے سے اٹھا اور ایک محافظ کی کمر سے تلوار کھینچی۔ سکندر خالی ہاتھ تھا۔ کھڑا رہا۔ کوئی اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ غصّے سے پھنکار رہا تھا۔ فیلقوس تلوار تانے سکندر پر وار کرنے آیا تو اُس کے قدم ڈگمگا گئے کیونکہ وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ سکندر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا باپ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

سکندر اپنے باپ کو اٹھانے کی بجائے ایک سٹول پر کھڑا ہوگیا اور محفل کے حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا ۔"آپ سب بلند عہدوں اور رُتبوں کے لوگ ہیں۔ ملک کی قسمت اور مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ اس شخص کو جو میرا باپ ہے، اس قابل سمجھتے ہیں کہ یہ ایشیا کو فتح کرے گا؟ یہ بادشاہ جو تلوار اٹھا کر دو قدم بھی نہیں چل سکتا، صرف مقدونیہ کے تخت و تاج کو سنبھالنے کے قابل نہیں۔ دیکھ لو اسے۔ شراب نے اسے کس طرح گرا دیا ہے"۔ اُس نے قلوپطرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس کی نئی بیوی کو دیکھو۔ اس کے حُسن اور اس کے ناز نخروں نے فیلقوس جیسے جابر جنگجو کو کس طرح بیکار کر دیا ہے۔ میرے بزرگو! عبرت حاصل کرو۔ میں کیوں شراب نہیں پیتا۔ صرف اس لیے کہ میں پاؤں پر کھڑا رہ سکوں۔ میں آپ کو ایشیا کی حکمرانی دینے کا عزم لیے ہوئے ہوں۔ میں اپنے باپ کے تخت پر بیٹھ کر شراب نہیں پینا چاہتا اور نئی بیویوں کی زنجیروں کا قیدی نہیں بنوں گا۔"

فیلقوس بے ہوش پڑا رہا۔ اعلیٰ حکام اور مہمانوں سے بھری ہوئی محفل پر سناٹا طاری رہا۔ کوئی بھی اس نوجوان کا سامنا نہ کر سکا۔ نوجوان سکندر محفل سے نکل گیا۔ اُس کا رُخ اُس قبرستان کی طرف تھا جہاں ایک جھونپڑے میں اُس کی ماں اولمپیاس رہتی تھی۔ وہ جھونپڑے تک پہنچا تو اُس کی ماں باہر کھڑی تھی۔ ہُو حق ویرانے اور صدیوں پُرانے قبرستان میں کھڑی اولمپیاس جنات کی مخلوق لگتی تھی۔ وہ اب ملکہ نہیں، سیدھے سادے لباس میں عام سی عورت تھی۔ اس سادگی میں اُس کا حُسن نکھر آیا تھا اور پُراسرار بھی ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ باہیں پھیلائے ہوئے آگے بڑھی، اُسے گلے لگایا اور اُس کی پیشانی کو چُوما۔

"میرے بیٹے!"۔ اولمپیاس نے سکندر سے کہا ۔"تم نے اطالوس کے سر پر شراب کا پیالہ توڑ کر شاید اچھا نہیں کیا۔"

سکندر نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پوچھا ۔"ماں! تمہیں اتنی جلدی کیسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں نے اطالوس کے سر پر شراب کا پیالہ مارا ہے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ تمہارا باپ تلوار تانے تم پر لپکا تھا مگر گر پڑا"۔ اولمپیاس نے مسکرا کر کہا ۔"اور تم نے وہاں کے لوگوں سے جو کچھ کہا تھا وہ مجھ سے لفظ بہ لفظ سُن لو۔ میں اس جھونپڑے میں رہتی ہوں لیکن مقدونیہ کا تخت و تاج میرے سائے سے آزاد نہیں۔"

سکندر کو یوں لگا جیسے اُس کی ماں میں کسی دیوتا کی رُوح داخل ہوگئی ہو یا وہ جادوگرنی بن گئی ہو۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی ماں ظاہری طور پر تارک الدنیا ہوگئی تھی لیکن محل کے خادموں، خادماؤں اور چند اور اہم افراد پر اُس کا جو رُعب، اثر و رسوخ اور سحر طاری تھا وہ بدستور قائم تھا۔ اُس کے پاس ان لوگوں کو معاوضہ اور انعام و اکرام دینے کے لیے بہت کچھ تھا جو اُس نے جھونپڑے میں دبا رکھا تھا۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اولمپیاس کے سحر کا یہ اثر بھی ہے کہ جس کے ہاتھ سے جسے چاہے قتل کرا سکتی ہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ تھی تو جھونپڑے میں مگر محل کی ایک ایک خبر فوراً اُس تک پہنچ جاتی تھی۔
سکندر جب قبرستان میں داخل ہُوا تھا تو اُسے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ایک آدمی اُس کی ماں کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ سکندر کے قدموں کی آواز سُن کر اور اُس کی ماں کو پُوری خبر سُنا کر دوسری طرف سے چلا گیا تھا۔

"ماں!" — سکندر نے کہا — "میں محل میں نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔"

"میرے نادان بیٹے!" — ماں نے اُس کے گال پر تھپکی دے کر کہا — "میں تمہیں صرف مقدونیہ کا نہیں، آدھی دُنیا کا فاتح اور بادشاہ بنانا چاہتی ہوں، مگر تم نے فرار کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ دشمنوں کے درمیان رہو اور اُن کا مقابلہ کرو.... آج رات میرے پاس رہو۔ مجھے سوچنے دو۔"

سکندر اپنی ماں کے پاس سو گیا۔ صبح جھونپڑے کے دروازے پر کوئی سکندر کو آوازیں دے رہا تھا۔ سکندر باہر نکلا۔ اُس کا بڑا ہی گہرا دوست بطلیموس آیا تھا۔ اولمپیاس بھی باہر نکل آئی اور بطلیموس سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ شاہ فیلقوس نے اُسے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سکندر اپنی ماں کے پاس گیا ہوگا۔ اُسے واپس لے آؤ۔

"وہ اپنے بیٹے سے انتقام لینا چاہتا ہے" — اولمپیاس نے کہا — "رات میرے بیٹے نے اُس کی نئی بیوی اور اُس کے چچا کی بہت توہین کی تھی۔"

"نہیں" — بطلیموس نے جواب دیا — "شاہ فیلقوس اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہیں۔ وہ غصّے میں نہیں پریشانی کی حالت میں ہیں۔"

سکندر نے کہا کہ وہ نہیں جائے گا۔

"تمہیں وہیں جانا ہے میرے بیٹے!" — اولمپیاس نے کہا — "دیوتا زیوس اور دیوتا شنر خاف کے ہاتھ تمہارے سر پر ہیں۔ میں تم سے دُور رہوں گی لیکن میری آنکھیں محل کی دیواروں کو پھاڑ کر تم پر لگی رہیں گی۔ مرے

کان محل کے اندر کی سرگوشیاں سنتے رہیں گے" — اُس نے سکندر کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا — "میرے بیٹے کو کسی نے بدنیتی کی آنکھ سے دیکھا تو یہ آنکھ اُس کے چہرے پر نہیں رہے گی.... تم چلے جاؤ سکندر! اپنی ماں کو اپنے ساتھ سمجھو۔"

سکندر اپنے دوست بطلیموس کے ساتھ چلا گیا۔ اولمپیاس جھونپڑے میں رہی اور اُسے محل کی خبریں ملتی رہیں۔ سکندر اپنے باپ کے سامنے گیا تو باپ نے اُسے گلے لگا لیا اور اتنے پیار کا مظاہرہ کیا جیسے رات کا واقعہ اُس کے ذہن سے اُتر گیا ہو۔ سکندر کو اطمینان ہو گیا کہ باپ اُسے سزا نہیں دے گا۔

دو روز بعد اولمپیاس رات کے وقت اپنے جھونپڑے میں لیٹی ہوئی تھی۔ نہایت آہستہ سے جھونپڑے کا دروازہ کھلا۔ اولمپیاس اُٹھ بیٹھی اور بولی — "کیا خبر لائے ہو؟"

"سکندر کی جان خطرے میں ہے" — جھونپڑے میں داخل ہونے والے نے کہا — "شاہ فیلقوس نے سکندر کو دھوکہ دیا ہے کہ سکندر نے محفل میں اطالوس اور قلوپطرہ کی جو بے عزّتی کی تھی اُس کی شاہ فیلقوس کو کوئی پرواہ نہیں۔ ان تینوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سکندر کو کھانے میں زہر دے دیا جائے۔ شاہ فیلقوس کے دل اور دماغ پر قلوپطرہ کا مکمل قبضہ ہے۔ جس روز سکندر نے اکیلے کھانا کھایا، اُس کے کھانے میں زہر ملا دیا جائیگا۔"

اولمپیاس نے سر ہلایا اور بولی — "تم چلے جاؤ۔"

تین چار روز بعد ویسی ہی ایک ضیافت تھی جس میں سکندر نے اطالوس کے سر پر شراب کا پیالہ توڑا اور قلوپطرہ کو تھپڑ مارا تھا۔ رقص و سرود اور شراب کی محفل گرم تھی۔ شاہ فیلقوس قلوپطرہ کو اپنے ساتھ بٹھائے ہوئے تھا۔ اچانک سکندر کی عمر کا ایک نوجوان فیلقوس کے سامنے گیا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے خنجر کا ایک وار فیلقوس کے دل پر کیا اور دوسرا پیٹ پر کر کے پیٹ چاک کر دیا۔ شاہ فیلقوس اُٹھا، گرا پھر کبھی نہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اُٹھ سکا۔ محفل سے دو تین آدمی خنجروں سے قاتل پر ٹوٹ پڑے اور اُسے وہیں ختم کر دیا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس نوجوان نے کیوں اور کس کے کہنے پر شاہ فیلقوس کو قتل کیا ہے۔ وہ بھی قتل ہو چکا تھا۔ یہ قاتل اولمپیاس کا بھیجا ہُوا تھا اور قاتل کو قتل کرنے والے بھی اولمپیاس نے بھیجے تھے تاکہ یہ پتہ ہی نہ چل سکے کہ قاتل کو کس نے بھیجا تھا۔

سکندر اُسی وقت اپنی ماں کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کا باپ قتل ہو گیا ہے۔

"اور قاتل بھی قتل ہو چکا ہے"۔ اولمپیاس نے کہا۔ "میں نے انتظام کر دیا تھا کہ وہ زندہ نہ رہے تاکہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ تمہارے باپ کو میں نے قتل کرایا ہے۔"

"یہ تم نے بہت بُرا کیا ماں!"۔ سکندر نے کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا، اچھا کیا یا بُرا کیا، صرف تمہارے لیے کیا ہے بیٹا!"۔ اولمپیاس نے کہا۔ "مقدونیہ کا تاج تمہارے سر پر رکھنے کے لیے میں اب تک دس آدمی قتل کرا چکی ہوں۔ یہ قلوپطرہ کے چاہنے والے تھے۔ ان کی مدد سے وہ تمہیں تخت کی وراثت سے محروم کر رہی تھی۔ تمہارا باپ اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ زندہ رہ سکے اور مقدونیہ کی بادشاہی پر سانپ بن کر بیٹھا رہے۔"

شاہ فیلقوس کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین کا فیصلہ کرنا تھا۔ جرنیل اور وزیر اکٹھے ہوئے۔ پہلا نام سکندر کا پیش ہُوا۔ اطالوس نے کہا کہ چونکہ فیلقوس نے سکندر کی ماں کو طلاق دے دی تھی اس لیے سکندر وراثت کے حق سے محروم ہو چکا ہے۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ دو ماہ بعد قلوپطرہ کے بطن سے فیلقوس کا بچّہ پیدا ہوگا۔ اُس کے بالغ ہونے تک قلوپطرہ کے سر پر مقدونیہ کا تاج رکھ دیا جائے۔

قلوپطرہ بھی وہاں موجود تھی۔ اُس کے چہرے پر رونق تھی۔ اُسے فیلقوس کے مرنے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اجلاس کے کئی ایک شرکا نے

اطالوس کی تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ تخت کا جائز وارث وہ بچّہ ہوگا جسے قلوپطرہ دو ماہ بعد جنم دینے والی ہے۔ اُس کی جوانی تک قلوپطرہ کو حکومت دے دی جائے۔

عین اُس وقت کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کُھلا۔ سب نے اُدھر دیکھا۔ دروازے میں سکندر کی ماں اولمپیاس کھڑی تھی۔ حکومت کے کاروبار میں اس کا عمل دخل ختم ہو چکا تھا۔ اس کا شاہی خاندان کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اب ایک عام عورت تھی۔ اُس کے سیاہ چمکیلے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کندھوں سے ٹخنوں تک ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی تمام جرنیل اور وزیر تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ اُس کے چہرے کے جلالی حسن کا اثر تھا ورنہ وہ اب تعظیم کے حق سے محروم تھی۔ اُس نے قہر بھری نظروں سے قلوپطرہ اور اُس کے چچا اطالوس کو دیکھا۔

"میں تم سب کو خبردار کرنے آئی ہوں کہ میرے بیٹے کو تخت کی وراثت سے محروم کیا گیا تو میں ایک غضب ناک بدرُوح کی طرح تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم سب مجھے جانتے ہو۔ تم جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم سب کی جانیں میری مٹھی میں ہیں۔ سوچو اور فیصلہ کرو۔"

وہ باہر نکل گئی۔ اُسی روز شاہی فرمان جاری ہُوا کہ آج سے شاہ فیلقوس کا بیٹا سکندر مقدونیہ کا بادشاہ ہے۔

ماں نے بیٹے کو بادشاہ بنا دیا لیکن اُس نے بیٹے سے کہا۔ "میرا کام ابھی ختم نہیں ہُوا۔ تجھے عظیم بننا ہے۔ ایشیا کا حکمران بننا ہے۔"

اُس وقت سکندر کی عمر بیس سال تھی۔ اُس نے سب سے پہلے یونان فتح کیا۔ اُس نے اِس میں صرف پندرہ ماہ صرف کیے۔ اُس کی عمر ابھی بائیس سال نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایشیا کی فتح کے لیے نکلا۔ اُس نے ایران فتح کیا پھر ہندوستان پر چڑھائی کی۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان بہت سی سلطنتیں تھیں جو اُس نے فتح کیں اور دُنیا کی تاریخ بدل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ڈالی۔ تاریخ میں ایسے بہت سے فاتح ملتے ہیں جنہوں نے سکندر سے زیادہ فتوحات حاصل کیں لیکن فرق یہ تھا کہ ہر حملہ آور نے بستیاں تباہ کیں، لُوٹ مار کی، عورتوں کو ذلیل و خوار کیا اور ظلم و تشدد سے لوگوں کو جنگلوں میں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے برعکس سکندر نے تباہی کی بجائے تعمیر کی۔ لُوٹ مار نہیں کی۔ اُس نے تباہ حال بستیوں کو آباد کیا اور جنگلوں میں رہنے والوں کو شہروں میں آباد کیا۔ اُس نے نئے شہر تعمیر کیے۔

اُس پر اپنے استاد ارسطو کا بہت اثر تھا۔ ارسطو نے اُسے یہی سبق دیا تھا کہ ہر انسان ایک خدا کا بندہ ہے اور ہر کسی کو باعزت زندگی گزارنے کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ سکندر نے اسی کو اپنا اصول بنایا۔ اُس نے اپنے آپ کو کوئی خطاب نہ دیا۔ اُسے مفتوحہ ملکوں کے لوگوں نے سکندرِ اعظم کہا۔

اُس کے اندر تجسّس تھا جسے ارسطو نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ وہ ہر لمحہ یہ جاننے کے لیے بے تاب رہتا تھا کہ پہاڑی کے دوسری طرف کیا ہے اور پہاڑی کو پھلانگ جاتا تھا۔

عمر نے وفا نہ کی۔ مقدونیہ سے نکلنے کے صرف گیارہ سال بعد سکندرِ اعظم مر گیا۔ وہ ۳۵۶ قبل مسیح میں پیدا ہُوا اور ۳۲۳ قبل مسیح میں مر گیا۔ اُس نے کُل ۳۳ سال عمر پائی۔ مرتے وقت اُس نے وصیت کی تھی کہ میرے دونوں ہاتھ تابوت سے باہر رکھنا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں کہ آدھی دُنیا کا فاتح دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے۔

خنجر جو دِل میں اُتر گیا

رنگیلا ایک بادشاہ تھا جس کا نام محمّد شاہ تھا اور جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا چراغ گُل ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم جمتے جا رہے تھے۔ محمّد شاہ رنگیلا دِلّی کا بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اس احساس سے بے نیاز کر رکھا تھا کہ اُس کے خاندان کی سلطنت ریزہ ریزہ ہو چکی ہے اور اُس کی اپنی بادشاہی کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔ وہ عیش و عشرت میں بدمست تھا۔ اُس کی راتیں شراب کی مستی میں گزرتی تھیں اور صبح اُس کے جاگنے کے وقت اُس کی خواب گاہ کے باہر چند ایک گانے والیاں دھیمے اور میٹھے سُروں میں کوئی راگ گنگناتی تھیں۔ اس ترنم سے رنگیلے بادشاہ کی آنکھ کھلتی تھی۔ ایک حسین کنیز جس کا نام گلبدن تھا رنگیلے بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوتی اور گلاب کے تازہ پھول سے اُس کے پاؤں کے تلوے سہلاتی۔ محمّد شاہ رنگیلا انگڑائی لے کر کروٹ بدلتا اور گلبدن کے عریاں کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتا اور سب سے پہلے میٹھی شراب کے چند گھونٹ پیتا تھا۔

یہ کہانی اس رنگیلے بادشاہ کی نہیں، ایک اور بادشاہ کی ہے جس کا نام نادر شاہ قلی خان تھا اور جو ایران سے ہندوستان آیا تھا اور یہ کہانی ایک بڑی ہی حسین اور باوقار عورت کی ہے جس کا نام ستارہ تھا اور جو محمّد شاہ رنگیلا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے نادر شاہ قلی خان کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

بادشاہ رنگیلا ہو تو امراء، وزرا اور فوج کے حاکم بھی رنگین مزاج ہو جاتے ہیں۔ دربار میں رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ خوشامدیوں کے وارے نیارے اور رعایا کا خدا حافظ ہوتا ہے۔ گناہ عام ہو جاتے ہیں۔ اخلاق نہیں رہتا، قانون نہیں رہتا۔ محمد شاہ رنگیلے کے دور میں شراب خوری اور بدکاری عام ہو گئی تھی۔ حاکم اُسی کا کام کرتے تھے جو رشوت میں شراب اور عورت پیش کرتا تھا۔ کسل سنگھ محمد شاہ رنگیلے کا ایک عہدیدار تھا۔ اُس نے دلّی کے قریب کسل پورہ نام کی ایک بستی بسا دی تھی جس میں اُس نے دُور دُور سے بڑی خوبصورت عورتیں لا کر آباد کیں اور وہاں پینے پلانے کا ایسا انتظام کیا جیسے شراب کی نہریں بہتی ہوں۔ دلّی کے عیّاش لوگ، شہزادے اور امیرزادے وہاں عیش و عشرت کے لیے جاتے تھے۔

انہی دنوں ۱۷۳۲ء میں ایران میں ایک گڈریئے کا بیٹا جس کا نام نادر شاہ تھا، سر اٹھا رہا تھا۔ نادر شاہ کو تاریخ ایک بہت بڑے جنگجو کی حیثیت سے یاد کرتی ہے۔ وہ ۱۶۸۷ء میں خراسان میں پیدا ہوا تھا۔ جوان ہوا تو اس میں کوئی اور ہی عزم اور جوش و جذبہ اُبھر آیا۔ اُس کا باپ مر گیا تو اُس نے باپ کی بھیڑ بکریاں بیچ ڈالیں اور اپنے جیسے چند ایک نوجوانوں کا ایک گروہ بنا لیا۔ اس گروہ نے قافلوں کو لُوٹنا شروع کر دیا۔ اس کا سردار نادر شاہ تھا جو بہت بڑے خزانے کا مالک بن گیا۔ اُس نے اپنے گروہ کی نفری میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور تھوڑے سے عرصے میں اُس کا گروہ چھ ہزار دلیر اور پُرعزم جوانوں کی فوج بن گیا۔

اُس وقت ایران کا بادشاہ شاہ تہماسپ دوم تھا۔ اُسے شاہِ افغانستان سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا۔ نادر شاہ نے اُسے کہا کہ وہ اپنی فوج سے افغانستان کی فوج کو شکست دے سکتا ہے۔ شاہِ ایران نے اُسے اجازت دے دی۔ نادر شاہ بیٹا تو گڈریئے کا تھا لیکن خدا نے اُسے عسکری فہم و فراست سے نوازا تھا۔ اُس نے اپنی چھ ہزار فوج سے جو دراصل رہزنی میں مہارت رکھتی تھی، افغانستان پر حملہ کر کے شاہِ ایران کے اس دشمن کو گھٹنوں بٹھا دیا اور اس سے اصفہان کا علاقہ چھین کر شاہِ ایران کی بادشاہی میں شامل کر دیا۔ اس کامیابی سے نادر شاہ کو ایک تو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی دوسرے وہ شاہِ ایران کے فیصلوں پر غالب آ گیا۔

کچھ عرصہ بعد شاہ تہماسپ نے ترکوں کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کر لیا جو نادر شاہ کو اچھا نہ لگا۔ نادر شاہ کی اپنی فوج تھی۔ اُس نے شاہ تہماسپ کا تختہ اُلٹ کر اُس کے بیٹے کو جس کی عمر صرف چھ مہینے تھی، شاہِ ایران بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۶ اگست ۱۷۳۲ء (۱۱۴۵ھ) کا ہے۔ ظاہر ہے نادر شاہ خود عملاً شاہ ایران بن گیا۔ یہ بچہ اُسی سال مر گیا۔ امراء وزراء نے نادر شاہ سے کہا کہ ایران کو دشمنوں سے بچانے کے لیے خود ایران کی بادشاہی سنبھال لے۔

نادر شاہ نے اپنی جنگی فہم و فراست کے بل بوتے پر ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر فوج کشی کی۔ وہ جن علاقوں سے گزرا انہیں تہ تیغ کرتا چلا آیا۔ اُس وقت دلّی کے تخت پر محمد شاہ رنگیلا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ گرد و پیش کے خطرات، اندرونی حالات اور حملہ آوروں سے بے نیاز تھا۔ نادر شاہ نے افغانستان کے دارالحکومت کابل کو محاصرے میں لے رکھا تھا۔ کابل کے حکمران اشرف نے محمد شاہ رنگیلے کو ایک تحریری پیغام بھیجا کہ وہ اُس کی مدد کو آئے اور اگر نادر شاہ نے کابل کو فتح کر لیا تو اس کا اگلا ہدف دلّی ہو گا۔

جب قاصد دلّی پہنچا، اُس وقت محمد شاہ رنگیلا مے نوشی میں مست اور مگن تھا۔ اُسے شاہِ کابل کا پیغام پڑھ کر سُنایا گیا۔ اُس نے پیغام اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے شراب کے پیالے میں ڈبو کر کہا۔ "اس بے معنی کاغذ کو شراب میں ڈوب جانا چاہیئے"۔۔۔ اور خطرے کا اتنا بڑا سگنل شراب کے نشے کی نذر ہو گیا۔

پھر یوں ہُوا کہ نادر شاہ نے کابل فتح کر لیا اور اُس نے دلّی کا رُخ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کیا۔ محمد شاہ رنگیلا کو اُس کی پیشقدمی کی اطلاعیں ملتی رہیں اور وہ رنگین راتوں میں جھومتا رہا، بدمست رہا، حتیٰ کہ اُسے نادر شاہ کا پیغام ملا کہ وہ دِلّی کا تخت و تاج اُس کے حوالے کر دے اور قتل و غارت تک نوبت نہ آنے دے۔ محمد شاہ رنگیلا نے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کے وزرا اور فوج کے اعلیٰ حکام اُسے یہی تاثر دیتے رہے کہ کوئی خطرہ نہیں، نادر شاہ ابھی بہت دُور ہے۔ رنگیلا بدمست رہا اور جان نہ سکا کہ اُس کے وزرا اور سالار جنگ سے بچنا چاہتے ہیں۔

نادر شاہ کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ دِلّی ایک خزانہ ہے جہاں دُنیا کا ایک عجوبہ تختِ طاؤس بھی ہے جس میں بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے ہیں اور وہاں زر و دولت کے انبار ہیں اور وہاں کا بادشاہ رنگین مزاج ہے، لڑنے کے قابل نہیں اور وہاں کے حاکم بھی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ نادر شاہ نے لڑے بغیر دِلّی پر قبضہ کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اُس نے محمد شاہ رنگیلے کو دو تین خط لکھے اور آخری خط میں دھمکی دی کہ اب وہ اپنے خطوط کا جواب لینے خود آئے گا۔ تب وزرا نے اپنے رنگیلے بادشاہ سے کہا کہ وہ نادر شاہ کو جواب دے دے۔

"ہم جواب دینا چاہتے ہیں"۔ محمد شاہ رنگیلا نے کہا۔ "مگر ہم سمجھ نہیں سکتے کہ نادر شاہ کو کس القاب سے مخاطب کیا جائے۔ وہ خاندانی بادشاہ نہیں۔ وہ ایک گڈریئے کا بیٹا ہے اور وہ رہزن اور ڈاکو ہے۔"

دربار میں یہی بحث چل پڑی کہ نادر شاہ کو کس القاب سے مخاطب کیا جائے۔ ہر درباری اور حاکم محمد شاہ رنگیلا کی ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا اور رنگیلا خود کسی فیصلے پر پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس بحث میں اتنے دن گزر گئے کہ نادر شاہ اپنی فوج کے ساتھ کرنال میں آخیمہ زن ہُوا۔ یہاں سے اُسے دِلّی پر حملہ کرنا تھا۔ پیشقدمی کا دن اور وقت مقرر کرنے کے لیے نادر شاہ نے اپنے دو وزیروں علی اکبر اور احمد خان قندھاری کو اپنے خیمے میں بلایا۔

نادر شاہ نے ان سے بات شروع کی ہی تھی کہ دربان نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔

"کیا ہے؟"۔ نادر شاہ نے غضبناک آواز میں کہا۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ....."

"جان بخشی شاہِ ایران و افغانستان!"۔ دربان نے کہا۔ "آپ کے غلام نے یہ گستاخی اس لیے کی ہے کہ مغل بادشاہ، محمد شاہ رنگیلا نے کچھ تحفے اور پیغام بھیجا ہے۔"

"تحفے کیا ہیں؟"

"ایک ہاتھی ہے"۔ دربان نے جواب دیا۔ "چند اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور پچاس غلام ہیں اور بہت سی جوان عورتیں ہیں جو اس قدر حسین ہیں کہ انہیں انتظار میں کھڑا رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہِ دِلّی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے"۔ نادر شاہ نے کہا۔ "وہ عقل والا معلوم ہوتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ایسے بادشاہ کی فوج بھی ایسی ہو گی اور وہ لڑنے کی جرأت نہیں کرے گی۔"

"شہنشاہِ ایران!"۔ احمد خان قندھاری نے کہا۔ "اس قسم کے بادشاہ جیسا کہ دِلّی کا بادشاہ محمد شاہ ہے، اپنی نجات کا ذریعہ اسی کو سمجھتے ہیں کہ دشمن کو دوست کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں اور اپنی رعایا کو بھی یہی یقین دلاتے رہتے ہیں کہ جسے وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں وہ دراصل اُن کا دوست ہے۔"

"اُس نے حسین عورتیں بھیج کر ہمیں بھی فریب دینے کی کوشش کی ہے"۔ نادر شاہ نے کہا۔ "کیا ہمیں یہ عورتیں قبول کر لینی چاہئیں؟"

"یہ فیصلہ شہنشاہ خود کریں تو بہتر ہو گا"۔ علی اکبر وزیر نے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ ایران کا حُسن دنیا کے گوشے گوشے میں مشہور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہے لیکن ہندوستان کے نسوانی حسن میں وہ جادو ہے جس سے ایران کی عورت محروم ہے۔ یہاں کی عورت کا قد سرو کی مانند ہوتا ہے اور اس کی رعنائی گلوں کو شرماتی ہے۔ یہاں کی عورت آہو چشم ہوتی ہے اور اس میں ہرن کی پھرتی پائی جاتی ہے.... اور جو عورت تحفے میں آتی ہے اُسے دیکھ کر تیر کمانوں سے نکل کر ترکش میں اور تلواریں نیاموں میں واپس چلی جاتی ہیں۔"

دوسرے وزیر احمد خان قندھاری نے بھی ہندی کنیزوں کا تصور کچھ ایسا پیش کیا کہ نادر شاہ اُٹھا اور خیمے سے نکل گیا۔ اُس نے حکم دیا کہ ہاتھی اور گھوڑے اصطبل کے حوالے کر دیئے جائیں اور غلام غلاموں کے احاطے میں چلے جائیں۔ وہ خود اُن عورتوں کے قریب چلا گیا جو محمد شاہ رنگیلا نے بھیجی تھیں۔ وہ عورتیں نہیں جوان لڑکیاں تھیں۔ اُس نے ہر ایک کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اُس کی نگاہیں گھومتی پھرتی ایک لڑکی پر جم گئیں۔ وہ دراز قد تھی اور اُس میں کوئی ایسا طلسم تھا جس نے نادر شاہ کو مسحور کر لیا۔ نادر شاہ نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تو لڑکی نے نظریں نیچی کر لیں۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" نادر شاہ نے کہا۔ "کیا ایسے ہیرے تحفے میں دیئے جاتے ہیں؟"

"یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے"۔ لڑکیوں کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی نے جواب دیا۔

"یہ جھوٹ بکتا ہے"۔ لڑکی نے نڈر ہو کر کہا۔ "میں دوشیزہ (کنواری) نہیں۔ میرا خاوند ہے۔ مجھے خاوند سے چھین کر زبردستی بھیجا گیا ہے۔"

ایسی عورتوں کو کنیزیں کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں جیسی ہوتی تھی۔ انہیں بولنے اور فریاد کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی مگر اس کنیز نے بڑی بے باکی سے بات کی تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے دِلّی کے آدمی نے چمڑے کا ہنٹر سیدھا کیا کہ ایسی گستاخ اور بے ادب کنیز کو زبان درازی کی سزا دے۔ کنیز نے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک خنجر نکال کر بولی ۔۔۔ "آگے آؤ اور مجھے ضرب لگا کر دیکھو۔"

سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ نادر شاہ سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ ایسی بدتمیز کنیز کو بخش دے گا۔ سب منتظر تھے کہ نادر شاہ حکم دے گا کہ اس لڑکی کو وحشی غلاموں کے حوالے کر دو، مگر سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نادر شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں کوئی اور ہی چمک تھی۔ اُس نے جب دِلّی کے اس آدمی کو دیکھا جس نے ہنٹر سے اس کنیز کو مارنا چاہا تھا تو نادر شاہ کی آنکھوں میں اور اُس کے چہرے پر قہر اُتر آیا۔ وہ آگے بڑھا۔

"لڑکی!"۔ نادر شاہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "خنجر ہمیں دے دو۔"

"خنجر راجپوت کی بیٹی کا زیور ہے"۔ لڑکی نے کہا۔ "جان دے دوں گی خنجر نہیں دوں گی۔"

"لڑکی!"۔ نادر شاہ نے غصّے سے نہیں شاہی جلال سے کہا ۔۔۔ "تمہاری قدر ہم جانتے ہیں، محمد شاہ کیا جانے!.... خنجر ہمیں دے دو۔"

جانے کیا بات تھی کہ لڑکی آگے بڑھی اور خنجر نادر شاہ کو دے دیا۔ نادر شاہ نے کہا۔ "ہم ان نازک ہاتھوں کے قدر دان ہیں جو خنجر کو اتنی مضبوطی سے پکڑ سکتے ہیں۔"

لڑکی نادر شاہ کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نادر شاہ پر بھی طاری تھی۔ نادر شاہ خیمے میں چلا گیا۔ اس کا ذاتی خادم اور محافظ ایک بلند قامت اور گٹھے ہوئے جسم والا حبشی آغا باشی تھا۔ نادر شاہ نے اُسے اندر بُلا کر کہا۔ "اس لڑکی کو اندر بھیج دو اور باقی لڑکیوں کو حرم میں داخل کر دو۔"

آغا باشی باہر نکل گیا اور چند لمحوں بعد وہ کنیز خیمے میں داخل ہوئی۔ خیمے میں مدھم سی روشنی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قندیل کی اس ہلکی ہلکی روشنی میں کنیز اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی اور نادر شاہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

"اب میں تمہارے چہرے پر خوف دیکھ رہا ہوں"۔ نادر شاہ نے کہا۔ "کیوں؟ یہ خوف کیسا؟"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"کیونکہ میرے ہاتھ میں خنجر نہیں"۔ لڑکی نے کہا۔ "سُنا تھا کہ شہنشاہ ایران بہت بڑا جنگجو اور طاقت ور ہے مگر میرے ملک میں آکر اُس نے سب سے ایک عورت سے ہتھیار ڈلوائے ہیں۔ کیا کوئی طاقتور بادشاہ اس پر فخر کر سکتا"

"زندہ باد!"۔ نادر شاہ نے بے ساختہ کہا۔ "ہم اُس عورت کی تلا میں تھے جو اپنی عصمت کو ہتھیار نہ سمجھے۔ عورت مرد کو اپنے حسن اور اپنی عص سے زیر کیا کرتی ہے مگر تم نے ہمیں اپنی غیرت اور حمیّت سے زیر کرنے کی کوشش کی ہے ... ہم تمہیں اپنی شہنشاہیت کے رعب سے زیر نہیں کریں گے تم نام کیا ہے؟"

"ستارہ!"۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا نام ستارہ ہے"۔

"تم اپنی قسمت کا چمکتا ہُوا ستارہ ہو"۔ نادر شاہ نے کہا۔ "تم کہا تھا کہ تمہارا خاوند بھی ہے؟"

"میں راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی تھی"۔ ستارہ نے کہا۔ "ابھی دس گیارہ سال کی تھی کہ میری خوبصورتی میری بدنصیبی کا باعث بن گئی مجھے مغلوں نے اغوا کر لیا اور میری شادی ایک مغل فوجی کے ساتھ کر دی گئی۔ میں وہاں سے بھاگ گئی مگر اپنے گھر نہ گئی تاکہ پھر نہ پکڑی جاؤں۔ میں اکیلی بھاگی جا رہی تھی کہ تاجروں کے ایک قافلہ سالار نے مجھے روک لیا اور پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے بتایا تو اُس نے شفقت سے مجھے پناہ میں لے لیا۔ قافلہ دِلّی جا رہا تھا۔ وہاں لے جا کر اس تاجر نے مجھے شہنشاہ کے حرم میں دے دیا۔ میں قید ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں اُس نے مجھے کس قیمت پر بیچا تھا۔ وہاں میں کنیز بن گئی اور اب آپ کو بطور تحفہ دے دی گئی ہوں"۔

"اب تم کنیز نہیں ہو"۔ نادر شاہ نے بے ساختہ کہا۔ "اب اپنے آپ کو ملکہ سمجھو"۔

"میں آپ کے قبضے میں ہوں"۔ ستارہ نے کہا۔ "مجھے فریب دینے کی آپ کو کیا ضرورت محسوس ہوئی ہے؟ مرد عورت کو یہی کہہ کر دھوکہ دیا کرتا ہے کہ تمہیں ملکہ بناؤں گا"۔

"ستارہ!"۔ نادر شاہ نے کہا۔ "ہم تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملکہ بنو گی؟"

"نہیں"۔ ستارہ نے کہا۔ "آپ کا قبضہ میرے جسم پر ہے میرے دل پر نہیں۔ میرا جسم آپ کو شہنشاہ تسلیم کرتا ہے، دل نہیں، کیونکہ آپ پر شاید میرے حسن کا سرور طاری ہے اور آپ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے ملکہ کہہ رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں چند راتوں کی ملکہ ہوں گی"۔

"ستارہ!"۔ نادر شاہ نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا۔ "ہمیں دل سے قبول کرو گی تو تمہارا جسم اس خیمے میں داخل ہو سکے گا۔ یہ ہماری درخواست ہے"۔

درخواست؟۔ ستارہ کانپ گئی۔ ایران کا جنگجو اور جابر شہنشاہ جو ملکوں، قلعوں اور فوجوں کو روندتا آیا تھا، ایک کنیز سے درخواست کر رہا ہے کہ مجھے دل سے قبول کر لو اور ملکہ بن جاؤ؟۔ اُس نے نادر شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ ایک جابر اور جنگجو بادشاہ کا چہرہ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وہ مرد جھانک رہا تھا جس کے ہاں حسین عورتوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی، محبت کی کمی تھی۔ ایک انتظار تھا۔ اُس عورت کا انتظار جو اُسے دل سے قبول کرے۔ ستارہ کے وجود میں اُسے وہ عورت نظر آ گئی تھی جو ہاتھ میں خنجر لے کر اُس کے پاس آئی تھی۔

ستارہ پر نادر شاہ کی اس کیفیت کا کچھ ایسا اثر ہُوا کہ وہ بے ساختہ نادر شاہ کے قدموں میں گر پڑی۔ نادر شاہ نے اُسے پیار سے اٹھایا۔

"اب تم نہیں، اب لوگ تمہارے قدموں میں گرا کریں گے"۔۔۔ نادر شاہ نے کہا۔ "اب تم کنیز نہیں ملکہ ہو"۔

نادر شاہ نے آغا باشی کو بلا کر حکم دیا کہ اس لڑکی کو لے جاؤ۔ احترام سے رکھو اور قاضی کو بلا لاؤ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد قاضی آ گیا جس نے نادر شاہ اور ستارہ کی شادی کر دی۔ ستارہ کا خیمہ الگ کر دیا گیا۔ نادر شاہ کے خیمے میں وہ کنیز کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی اور ملکۂ ایران بن کر نکلی۔ اُس روز کے بعد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نادرشاہ ستارہ کے خیمے میں جاتا تھا تو وہ شاہِ ایران نہیں بلکہ بیوی سے دلی محبت کرنے والا شوہر ہوتا تھا۔

پورا حرم نادرشاہ کے ساتھ تھا۔ اس میں ایران، خراسان اور افغانستان کی دو چار ایسی حسین اور چالاک عورتیں بھی تھیں جو نادرشاہ کی منظورِ نظر تھیں۔ ان میں ایک کا نام شیرازی تھا۔ بہت خوبصورت اور دلفریب تھی۔ اسے نادرشاہ کی چہیتی کہا جاتا تھا۔ ستارہ آئی تو شیرازی کو گرہن لگ گیا۔ اب نادرشاہ حرم کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ حرم کی عورتوں نے ستارہ کی خوشامد اور منٹھی چاپی شروع کر دی کیونکہ وہ اب اُن کی ملکہ تھی۔ شیرازی نے بھی یہی رویّہ اختیار کیا۔ وہ بہت ہی چالاک عورت تھی۔ اُس نے زبان کے جادو سے ستارہ کو اپنی ہمراز سہیلی بنا لیا مگر شیرازی ستارہ اور نادرشاہ میں غلط فہمی پیدا کر کے ستارہ کو اس رُتبے سے گرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

نادرشاہ کو دِلّی پر قبضہ کرنا تھا۔ اُس کی فوج خیمہ گاہ میں بیکار پڑی تھی۔ یہ کیفیّت فوج کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ نادرشاہ نے دلّی کی طرف کُوچ کا فیصلہ کیا اور رات کو ایک بیش قیمت ہیرا ستارہ کو دے کر کہا ــــ "تم میرے ساتھ رہو گی لیکن دوسرے ملک پر جب فوج کشی کی جاتی ہے تو کچھ دنوں کے لیے جُدائی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اگر تمہیں میری ضرورت پڑے تو یہ ہیرا قاصد کے ہاتھ بھیج دینا۔ میں آ جاؤں گا۔ اس ہیرے کے بغیر میں تمہارے پیغام پر اعتبار نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے پیغام کے دھوکے میں مجھے دشمن گھات میں لا کر قتل کر سکتا ہے۔"

دوسرے دن نادرشاہ نے دِلّی کی طرف کوچ کیا۔ توقع تھی کہ بہت لڑائی ہو گی۔ دِلّی کا محاصرہ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد کامیاب ہو، شاید ناکام ہی لوٹنا پڑے مگر جاسوس بتا رہے تھے کہ دِلّی میں امن و امان ہے۔ بادشاہ پہلے کی طرح امراء، وزراء اور سالاروں کے ساتھ رنگین زندگی گزار رہا ہے۔ کوئی جنگی تیاری نہیں۔ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا تھا۔ نادرشاہ چوکنا ہو گیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ راستے میں اُس کی فوج کے پڑاؤ پر حملہ ہو گا مگر کچھ بھی

نہ ہُوا۔

دِلّی میں یہ کیفیّت تھی کہ محمّد شاہ رنگیلا کو نادرشاہ کے کوچ کی اطلاعیں مل رہی تھیں اور اُس نے حکم دے دیا تھا کہ نادرشاہ آئے تو اُس کا استقبال دوست کی حیثیت سے کیا جائے اور شہر کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ اُس کے سالار اپنی فوج سمیت اس قدر آرام طلب اور رنگین مزاج ہو گئے تھے کہ انہوں نے محمّد شاہ رنگیلا کے اس حکم کی بہت تعریف کی۔

آخر نادرشاہ دِلّی کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ وہاں اُس کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ ستارہ جو دلّی سے کنیز بن کر نکلی تھی، ملکہ بن کر داخل ہوئی اور محمّد شاہ رنگیلے کی ملکہ نے آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے ستارہ اس ملکہ کی کنیز تھی۔ محمّد شاہ رنگیلے کی ملکہ نے ستارہ سے التجا کی کہ وہ شہنشاہِ ایران سے کہے کہ دِلّی میں لُوٹ مار اور قتل و غارت نہ ہو اور شہنشاہ محل میں ایک دوست کی حیثیت سے داخل ہو۔

"اس کا انحصار آپ کے رویّے پر ہے" ــ ستارہ نے کہا ــ "اگر آپ کی طرف سے مزاحمت نہیں ہو گی تو قتل و غارت کیوں ہو گی۔ میں شہنشاہِ ایران نادرشاہ سے کہہ دوں گی کہ وہ دلّی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔"

ستارہ کے کہنے پر نادرشاہ نے حکم دے دیا کہ دلّی کے لوگوں کا احترام کیا جائے۔

محمّد شاہ رنگیلا نے نادرشاہ کا استقبال کیا۔ ایران کی فوج کو توقع تھی کہ دِلّی کی لُوٹ مار انہیں مالا مال کر دے گی۔ انہوں نے سُن رکھا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت مالدار ہیں مگر لُوٹ مار ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس حکم سے فوج میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سالاروں تک نے ناک بھوں چڑھائی۔ شیرازی کو موقع مل گیا۔ اُس نے سالاروں میں مشہور کر دیا کہ نادرشاہ نے یہ حکم ستارہ کے کہنے پر جاری کیا ہے اور وہ یہاں کا خزانہ سمیٹنا چاہتی ہے۔ اُس زمانے میں مالِ غنیمت میں سے فوج کے ہر فرد کو حصّہ ملا کرتا تھا۔ یہ سب سے بڑی کشش تھی جو لوگوں کو فوج میں لے جاتی تھی۔ شیرازی نے ستارہ

www.paksociety.com

Scanned By Azeem Paksitanipoint

کے خلاف خاصی نفرت پیدا کر دی۔ بعض فوجی حکام نادر شاہ کو بھی ناپسند کرنے لگے کہ اس کے احکام ایک عورت کے پابند ہو گئے ہیں۔

ستارہ نے اپنی طرف سے بھی اعلان کرا دیا کہ کوئی ایرانی سپاہی کسی ہندوستانی سپاہی یا شہری کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا مگر ہوا یوں کہ لوگ عید قربان منا رہے تھے کہ دن کے پچھلے پہر دِلّی میں ایرانی فوج کے چند ایک سپاہی جو شہر کی کسی نہ کسی گلی میں اکّے دکّے گھوم پھر رہے تھے ہندوستانی سپاہیوں نے قتل کر دیئے۔ اُس وقت دلّی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز فوجی بھی تھے جو محمّد شاہ رنگیلا نے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ایک ہی رات میں ایرانی سپاہیوں کے علاوہ سات سو انگریز بھی ہندوستانیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ رات بھر قتلِ عام جاری رہا۔ نادر شاہ کو اطلاع ملی تو حیران ہُوا کہ یہ کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس کی ملکہ ستارہ اپنی جگہ پریشان تھی۔

صبح کو نادر شاہ گھوڑے پر سوار دِلّی شہر میں اس خیال سے نکلا کہ اُسے دیکھ کر ہندوستانی سپاہی ہاتھ روک لیں گے مگر نادر شاہ پر پتھر برسائے گئے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ اُس پر بندوقیں بھی چلائی گئیں اور ایک محافظ زخمی ہو گیا۔ نادر شاہ کو کئی جگہوں پر ایرانی سپاہیوں کی لاشیں پڑی نظر آئیں۔ نادر شاہ نے غصّے میں آ کر حکم دیا — ”جہاں کسی ایرانی سپاہی کی لاش پڑی ہو وہاں کے اردگرد کے علاقے میں دِلّی کا ایک بھی باشندہ زندہ نہ رہے۔“

ایرانی فوج ایسے ہی حکم کی منتظر تھی۔ حکم ملتے ہی دِلّی پر ٹوٹ پڑی اور ایسا قتلِ عام کیا جو دِلّی کی تاریخ نے اُس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ فوج اور شہریوں کو ملا کر دو لاکھ انسان قتل کر دیئے گئے۔ ستارہ کو جب پتہ چلا کہ ایرانیوں نے دِلّی والوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہے تو اُس نے نادر شاہ کو پیغام بھیجا پھر بھی قتلِ عام جاری رہا۔ ستارہ نے وہ ہیرا جو نادر شاہ نے اُسے دیا تھا، نادر شاہ کو بھیجا پھر بھی قتلِ عام جاری رہا۔ آخر ایک مغل شہزادے آصف جاہ کی منّت سماجت پر قتلِ عام بند ہُوا۔

بعد میں پتہ چلا کہ ایرانیوں کا قتلِ عام نادر شاہ کی سابقہ منظورِ نظر شیرازی

نے ایک افواہ اُڑا کر شروع کرایا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے مغل فوجیوں میں کسی کی وساطت سے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ رات چند ایک ایرانی سپاہیوں نے چند ایک مغل فوجیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس افواہ کے ساتھ ہی شیرازی کے کرائے کے افواہ بازوں نے مغل سپاہیوں میں ایسا اشتعال پھیلایا کہ انہوں نے جہاں کہیں اکیلا ایرانی سپاہی دیکھا اُسے قتل کر ڈالا۔ ایک عورت کے

جذبۂ رقابت نے ساری دِلّی کو خون میں ڈبو دیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ستارہ نے نادر شاہ سے یہ جو حکم دلایا تھا کہ دِلّی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے وہ بیکار ہو جائے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ نادر شاہ دِلّی کے قریب ایک محل نما خیمے میں رہتا تھا اور محمّد شاہ رنگیلا دِلّی میں اپنے محل میں رہتا اور بدستور عیش و عشرت میں مگن تھا۔ عملاً حکومت نادر شاہ کی تھی۔ دونوں بادشاہ مل بیٹھتے اور گپ شپ ہوتی تھی۔ ان کی محفلوں کے دو واقعات دلچسپ ہیں۔ ایک یہ کہ نادر شاہ کو قبض کی شکایت ہو گئی۔ محمّد شاہ رنگیلے نے اس کے لیے گلقند منگوائی جو ایک بڑے خوبصورت مرتبان میں تھی۔ طشتری میں چاندی کا ایک خوبصورت چمچ تھا۔ گلقند صرف دو چمچ کھانی تھی۔ نادر شاہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ دوائی ہے جس کی مقدار کی ایک حد ہوتی ہے۔ اُس نے گلقند ایک چمچ کھائی اور بولا — ”حلوہ بہت لذیذ ہے“ — اور آدھا مرتبان کھا گیا۔

محمّد شاہ رنگیلا کے دربار کی ایک مغنّیہ نور بائی تھی۔ ایک رات نادر شاہ نے اُس کا گانا سُنا جو اُسے اِتنا اچھا لگا کہ اُس نے نُور بائی کو انعام دیا اور بولا — ”نور بائی! رُوئے ہند را سیاہ کن۔ بیا کہ بہ ایران ات بریم“ — (نور بائی! ہندوستان کے چہرے پر سیاہی پھیر۔ آ میں تجھے ایران لے چلوں)۔

نور بائی حاضر جواب تھی۔ وہ نادر شاہ کے ساتھ ایران جانے سے انکار کرنا چاہتی تھی مگر نادر شاہ کے عتاب سے ڈرتی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ اس پیش کش کے جواب میں ایک غزل سنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ اُس نے ایک غزل گائی:

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

من شمعِ جانگدازم تُو صبحِ دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رُخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم، دور آنچنا کہ گفتم
نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

(میں اپنی جان کو پگھلانے والی شمع ہوں اور تُو دلکشا صبح ہے۔ جب تک میں تجھے نہ دیکھ لوں، جلتی رہتی ہوں لیکن جوں ہی تُو اپنی صورت دکھاتا ہے میں مرجاتی ہوں۔ تیرے نزدیک رہ کر میرا یہ حال ہے اور دُور رہ کر وہ حال ہے جو میں نے ابھی بتایا ہے اس لیے مجھ میں نہ تیرے وصل کی تاب ہے نہ جُدائی کی طاقت ہے)۔

نادرشاہ مُسکرایا۔ وہ نور بائی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

نادرشاہ نے اپنے ایک بیٹے کی شادی دِلّی کی ایک شہزادی سے کی اور محمد شاہ رنگیلا سے بے شمار زر و جواہرات لے لیے۔ یہاں تک کہ تختِ طاؤس بھی اٹھا لیا جو آج تک شاہِ ایران کے محل میں پڑا ہے۔ محمد شاہ رنگیلا نادرشاہ کو دوست بنائے رکھنا چاہتا تھا اس لیے اُس نے اپنے تخت و تاج کے تحفّظ کی خاطر نادرشاہ کی ہر فرمائش پُوری کی۔ اس طرح نادرشاہ نے دِلّی کا خزانہ خالی کر دیا اور اربوں روپے کی مالیّت کے زر و جواہرات، ہیرے اور نقد سمیٹ کر شمالی ہندوستان کی طرف چل پڑا۔

بڑا لمبا سفر طے کر کے وہ اپنی فوج کے ساتھ ایک دریا کے کنارے پہنچا اور فوج کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ وہ ایک اجنبی دیس کو جا رہا تھا۔ اُس نے اس علاقے کے قبائلی سرداروں کو بُلا کر اُن سے اطاعت قبول کرائی اور ان سے گائیڈ لیے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ بڑی گہری نیند سو گیا لیکن ستارہ کو نیند نہ آئی۔ اُس کے دل پر ایک خوف طاری رہنے لگا تھا۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ شیرازی جو اُس کی رقیب ہے، انتقام کی آگ میں جل رہی ہے اور کسی بھی وقت وہ کوئی اوچھا وار کر سکتی ہے۔ ستارہ کے کان میں یہ بھنک

بھی پڑی تھی کہ شیرازی نے دو تین امراء وزراء کو نادرشاہ کے خلاف کر دیا ہے اور نادرشاہ کی زندگی خطرے میں ہے۔ اُس نے نادرشاہ کو خبردار کیا تھا مگر نادرشاہ کو فتوحات اور دِلّی کے خزانے نے متکبّر اور مغرور بنا دیا تھا۔

"کیا کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ ایران کے شہنشاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے؟" نادرشاہ نے ستارہ سے کہا تھا — "تم سے جلنے والے جلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے"۔

ستارہ کی تشفی نہیں ہوئی۔ اُس کی ایک حِس اُسے خبردار کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس رات نادرشاہ گہری نیند سو گیا مگر ستارہ نہ سو سکی۔ اُسے خیمے سے باہر دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اٹھی اور دبے پاؤں خیمے کا جا پردہ اٹھایا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی پیٹ کے بل رینگتا خیمے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ خیمے کے نیچے سے اندر آنا چاہتا تھا۔ ستارہ خیمے میں گئی۔ تلوار اٹھائی اور نادرشاہ کو جگا دیا۔ دونوں باہر نکلے تو انہیں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو رات کی تاریکی میں غائب ہو گئیں۔ نادرشاہ نے اپنے محافظوں کو پکارا مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ آگے جا کر دیکھا۔ اُس کے محافظ مرے پڑے تھے۔ انہیں ایسے طریقے سے قتل کیا گیا تھا کہ اُن کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی۔

نادرشاہ نے اپنے سالاروں کے لیے قیامت بپا کر دی مگر قاتلوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ستارہ نے شیرازی پر شک کا اظہار کیا لیکن شیرازی نے ایسے انداز سے اور ایسے الفاظ میں اپنی بے گناہی کا اظہار کیا کہ نادرشاہ نے اُسے بے گناہ سمجھ لیا مگر حقیقت میں یہ قاتلانہ حملہ شیرازی نے ہی کرایا تھا۔

کچھ عرصے بعد نادرشاہ ہرات پہنچا۔ اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا بیٹا جو ولی عہد ہے اُس کے استقبال کے لیے آرہا ہے۔ باپ بیٹے کو جُدا ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ دو روز بعد بیٹا باپ سے آملا۔ نادرشاہ بہت خوش تھا۔ ستارہ بھی خوش تھی مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ شیرازی

نادر شاہ سے تنہائی میں ملی۔

"آپ نے مجھ پر قاتلانہ حملے کا شک کیا تھا"۔۔۔ شیرازی نے اُسے کہا۔۔۔ "میں اُس روز سے چین کی نیند نہیں سوئی۔ آپ میری پہلی اور آخری محبت ہیں۔ آپ مجھے دھتکار دیں مگر میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ آپ کو ہر خطرے سے بچاؤں اور آپ کے دل سے اپنے خلاف تمام شکوک دھو ڈالوں۔۔۔۔ آج آپ نے اپنی موت کو گلے لگایا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"۔۔۔ نادر شاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔۔۔ "کون ہے جو میری موت کا پیغام لایا ہے؟"

"آپ کا اپنا بیٹا!"۔۔۔ شیرازی نے کہا۔۔۔ "جو میں جانتی ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ میں نے آپ کے ولی عہد کو ستارہ کے خیمے میں دیکھا ہے اور میں نے جو دیکھا ہے اس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ کا ولی عہد آپ کی وفات کا انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ نے سوچا کہ وہ اتنی فوج لے کر یہاں کیوں آگیا ہے؟۔۔۔۔ آپ کو قتل کرنے۔ میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے شک ہے کہ ستارہ نے اُس کے ساتھ ساز باز کی ہے۔ اُس نے آپ کے نوجوان فرزند پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔ آپ یہ نہ بھولیں کہ ستارہ خاندانی ملکہ نہیں۔ وہ ایک سپاہی کی بیوی تھی پھر وہ حرم کی ایک ادنیٰ کنیز بنی۔ اس سے آپ اچھے کردار کی توقع نہیں رکھ سکتے۔"

نادر شاہ کا دماغ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو سکندر اعظم اور چنگیز خان سمجھنے لگا تھا۔ اُس میں اپنے خون کے رشتوں کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ شیرازی کا جادو چل گیا۔ نادر شاہ نے حکم دیا کہ ولی عہد کی آنکھیں نکال دی جائیں۔ تختِ طاؤس ہمارا منتظر ہے۔

"شہنشاہ!"۔۔۔ ستارہ نے گھبرا کر کہا۔۔۔ "یہ آپ نے کیسا حکم دیا ہے۔ کیا باپ اپنے بیٹے کی آنکھیں نکلوا سکتا ہے؟"

"کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور تم اُس کی

طرفداری کیوں کر رہی ہو؟"

ستارہ نادر شاہ کو قائل نہ کر سکی۔ منت سماجت کرتی رہی۔ آخر نادر شاہ تنگ آ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ستارہ کو پتہ چلا کہ نادر شاہ شیرازی کے خیمے میں چلا گیا ہے۔ وہاں سے وہ اپنے خیمے میں چلا گیا اور ستارہ اپنے خیمے میں آنسو بہاتی رہی۔ شیرازی ولی عہد سے جا ملی اور اُسے بتایا کہ اس کے باپ نے اُسے اندھا کر دینے کا حکم دے دیا ہے اور اُسے صرف ستارہ بچا سکتی ہے۔

ولی عہد اُسی وقت ستارہ کے خیمے میں چلا گیا۔ اِدھر شیرازی نے نادر شاہ کو بتا دیا کہ ولی عہد رات کے اس وقت ستارہ کے خیمے میں ہے۔ نادر شاہ کچھ بھی نہ بولا۔ دوسرے دن ستارہ نے نادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اندھا کرنے کا حکم واپس لے لے۔

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں بھی اندھا کر دوں؟"۔۔۔ نادر شاہ نے غضب ناک آواز میں کہا۔

"ظلِ نادر شاہ!"۔۔۔ ستارہ نے نادر شاہ کی آواز سے زیادہ غضبناک آواز میں کہا۔۔۔ "تجھے تختِ طاؤس نے اندھا کر دیا ہے۔ دلّی کے زرد جواہرات نے تیری عقل پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ تجھ میں رحم اور رعونت کا امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ تجھے یاد نہیں رہا کہ جس خدا نے تجھے بادشاہی دی ہے وہ بادشاہی چھین بھی سکتا ہے۔ تیرے دماغ پر وہ خون چڑھ گیا ہے جو تُو نے دلّی کی گلیوں میں بہایا ہے۔۔۔۔"

نادر شاہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے خنجر اٹھا کر اس قدر زور سے ستارہ کے ماتھے پر مارا کہ نوک کھوپڑی میں اُتر گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ نادر شاہ اُس کی حسین پیشانی سے خون بہتا دیکھتا رہا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ اُس کا عتاب ماند پڑ گیا۔ وہ جو ایک جابر جنگجو تھا اور ایران کا شہنشاہ تھا، ایک جذباتی آدمی بن گیا۔ اُس نے خنجر پھینک دیا اور پلنگ پر اوندھے منہ گر کر بہت رویا۔ اس کا ذاتی خادم اور محافظ آغا باشی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خیمے میں داخل ہُوا۔ اُسے ستارہ سے محبت بھی تھی عقیدت بھی۔ وہ ستارہ کو اٹھا لے گیا اور اُسے طبیب کے خیمے میں جا لٹایا۔ ستارہ کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

"کیا مجھے اس کا علاج کرنا چاہیئے؟" طبیب نے پوچھا "شہنشاہ ناراض تو نہ ہوں گے؟"

"اگر آپ نے علاج نہ کیا تو خدا ناراض ہوگا" آغا باشی نے کہا "آپ ستارہ کو جانتے ہیں۔ کنیز سے ملکہ بن کر اس کے دل میں خوفِ خدا اور انسانوں کا پیار زندہ رہا مگر شہنشاہ گڈریئے سے شاہِ ایران بن کر اپنے بیٹے کے دشمن بن گئے۔ آپ مسیحا ہیں۔ اپنے اس فرض کو دیکھیں جو خدا نے آپ کو سونپا ہے۔ اس کی جان بچائیں ورنہ روزِ قیامت آپ قاتلوں کی صف میں کھڑے ہوں گے..... میں آپ کو شہنشاہ کی ناراضگی سے اس طرح بچا سکتا ہوں کہ صبح شہنشاہ سے کہہ دوں گا کہ ستارہ رات مر گئی تھی اور میں رات ہی رات اس کی لاش کو جنگل میں دفن کر آیا ہوں۔"

طبیب نے ستارہ کی مرہم پٹی کر دی۔ آغا باشی نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر رات کو ہی ستارہ کو بہت دُور ارمنی خاندان کے ہاں بھجوا دیا۔ ستارہ کئی روز بے ہوش رہی۔ ارمنی خاندان اُس کا احسانمند تھا۔ اس خاندان نے احسان کا صِلہ دینے کے خیال سے ستارہ کو سنبھال لیا۔ ستارہ نے آنکھ کھولی تو اُس نے نادرشاہ کی خیریت پوچھی۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ نادرشاہ سے بہت دُور ہے اور نادرشاہ کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔

ستارا کو جو دُکھ ہونا تھا ہُوا مگر نادرشاہ اُس کے غم میں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ تاسف اور پچھتاوا اُسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس کی شاہانہ آب و تاب بجھتی جا رہی تھی۔ اُس نے شیرازی کو دھتکار دیا تھا۔ حرم کی کوئی عورت اُس کا دل نہ موہ سکی۔ ادھر ستارہ عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ نادرشاہ کے پاس چلی گئی تو اُسے جس جس آدمی نے بتایا تھا کہ وہ مر گئی ہے وہ نادرشاہ کی تلوار کا شکار ہو جائے گا۔ ان لوگوں میں آغا باشی بھی تھا اور طبیب بھی۔ وہ انہیں جھوٹ کی سزا سے بچانا چاہتی تھی۔

وقت گذر رہا تھا۔ ایک سال گزر گیا۔ نادرشاہ کے ہاتھوں سے عنانِ حکومت نکلتی جا رہی تھی۔ اُس کا دماغ اُس کا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ تختِ طاؤس اور زر و جواہرات کے انبار اُس کا دل نہ بہلا سکے۔ اُس نے اس حقیقت کو پا لیا کہ دولت بادشاہ بنا سکتی ہے قلبی سکون نہیں دے سکتی اور بادشاہی اس کے ہاتھوں انسانوں کا خون بہا سکتی ہے کسی ایک بھی انسان کا دل نہیں جیت سکتی۔ نادرشاہ کو یہ پچھتاوا پاگل کیے جا رہا تھا کہ وہ ستارہ کا قاتل ہے۔

وہ ایران پہنچ چکا تھا۔ اُس کی دگرگوں ذہنی کیفیت نے اُس کے دربار میں کچھ دشمن پیدا کر دیئے۔ یہ تخت کے ہوس کار تھے — ایک اور سال گزر گیا۔ ایک روز اس ارمنی گاؤں میں جہاں ستارہ رہتی تھی، یہ خبر پہنچی کہ نادرشاہ اپنی فوج کے ساتھ اس گاؤں کے قریب سے گزر رہا ہے۔ ستارہ کے دل نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ نادرشاہ کے پاس چلی جائے۔ وہ تمام خطرے بھول گئی۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ نادرشاہ کی رعونت ختم ہو چکی ہے اور اُس پر خاموشی طاری رہتی ہے۔

ستارہ نے نادرشاہ کے نام ایک پیغام لکھا اور ایک آدمی کو دے کر اُسے وہ ہیرا بھی دیا جو نادرشاہ نے اُسے دِلّی پر فوج کشی کے وقت دیا تھا۔ اُس نے اپنے قاصد سے کہا کہ وہ یہ پیغام اور ہیرا نادرشاہ کے سوا اور کسی کو نہ دے۔

نادرشاہ کا پڑاؤ دُور نہیں تھا۔ ستارہ کا قاصد سیدھا نادرشاہ کے پاس گیا۔ نادرشاہ نے ستارہ کا پیغام پڑھا تو اُسے یقین نہ آیا لیکن ہیرا دیکھ کر اُس نے ایک گھوڑ سوار دستے کو حکم دیا کہ جا کر ستارہ کو لے آئے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رات کے وقت ستارہ شاہی سواری میں نادرشاہ کے پاس پہنچ گئی۔ نادرشاہ کو جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اب وہ مسرت سے دیوانہ ہُوا جارہا تھا مگر اُس کی شہنشاہیت کی بنیادوں میں کیڑا لگ چکا تھا۔ ۱۰ مئی ۱۷۴۷ء (۱۰ جمادی الاوّل ۱۱۶۰ ہجری) کی رات تھی۔ نادرشاہ اور ستارہ اُس خیمے میں تھے جہاں دو سال بعد اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ نادرشاہ گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ ستارہ یوں جاگ رہی تھی جیسے اس کی حفاظت کر رہی ہو۔

خیمے کے باہر اُسے سرکتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دبے پاؤں خیمے سے نکلی مگر خیمے کے دوسرے دروازے سے تین آدمی داخل ہوئے۔ ان میں نادرشاہ کا بھتیجا علی قلی خان تھا اور دو اور آدمی تھے جنہیں ستارہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک صالح محمّد خان تھا اور دوسرا محمّد خان قاچار تھا۔ بیشتر اس کے کہ ستارہ شور و غوغا کرتی، تینوں نے سوئے ہوئے نادرشاہ کا خنجروں سے کام تمام کر دیا۔ محافظ باہر آرام اور اطمینان سے کھڑے رہے۔

کسی نے باہر محافظوں کو حکم دیا کہ نادرشاہ کی لاش اٹھا کر کہیں دفن کر دو۔ محافظ خیمے میں گئے تو وہاں ایک کی بجائے دو لاشیں پڑی تھیں۔ نادرشاہ کی لاش پر ستارہ کی لاش یوں پڑی تھی جیسے وہ زندہ نادرشاہ سے لپٹی ہوئی ہو۔ اُسے الگ کرنے لگے تو دیکھا کہ ستارہ کے دل میں خنجر اُترا ہُوا تھا۔ یہ وہ خنجر تھا جو ستارہ نے اُس وقت نکالا تھا جب نادرشاہ پہلے روز اُسے تحفے میں آئی ہوئی کنیزوں میں دیکھنے نکلا تھا۔ نادرشاہ اور ستارہ کی محبّت کی ابتدا اسی خنجر سے ہوئی تھی ـــــ ستارہ نے یہ خنجر اپنے دل میں اُتار لیا اور نادرشاہ کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہوئی۔

نادرشاہ کو اس کے قاتل بھتیجے نے مشہد میں دفن کرایا۔ ستارہ کی قبر کی کچھ خبر نہیں کہاں ہے۔

پدمنی اور علاؤالدّین خلجی

علاؤالدّین خلجی جابر، سخت گیر اور انصاف پسند بادشاہ اور بہترین سپہ سالار تھا۔ وہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود علم دوست تھا۔ اپنی فتوحات اور انصاف پسندی کی وجہ سے وہ ہندوستان کے بہترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اُس کی زیادہ تر فتوحات ہندو راجاؤں کے خلاف تھیں۔ اُس نے منگول حملہ آوروں اور باغیوں کے خلاف بھی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ متعصّب ہندو مؤرخین نے جہاں اس کی فتوحات اور بہترین سپہ سالاری کا اعتراف کیا ہے وہاں اُسے ظالم، سنگدل اور ہندوؤں کا قاتل بھی بتایا ہے۔ علاؤالدّین خلجی دراصل اپنے دشمنوں کو بہت کم معاف کیا کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور معمولی نوعیّت کے جرائم کی سزا بھی سخت ہوتی تھی۔

ملک میں ہر شے کی قیمت مقرّر تھی۔ ان اشیاء میں گھوڑے اور اونٹ بھی شامل تھے۔ ذخیرہ اندوزی اور زائد قیمت وصول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ علاؤالدّین خلجی کے ایک امیر نے بادشاہ کو اچھے موڈ میں دیکھ کر کہا ـــ "بادشاہ سلامت کو گانے والیوں کی اُجرتیں مقرّر کرنی چاہئیں کیونکہ وہ من مانی رقم وصول کرتی ہیں۔"

علاؤالدّین خلجی کو البتہ تاریخ اس لیے کبھی معاف نہیں کر سکتی کہ اُس نے غدّار اُمراء اور بھائیوں کی مدد سے اپنے شفیق چچا اور سُسر سلطان جلال الدّین خلجی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کو قتل کروا کر تخت پر قبضہ کیا تھا۔ اپنے چچا کو قتل کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ علاؤالدین کی بیوی اُس کے اسی چچا کی بیٹی تھی اور بادشاہ کی بیٹی ہونے کے باعث اُس پر رُعب جماتی اور زیادہ وقت اُس سے دُور گزارتی تھی۔ اسی وجہ سے علاؤالدین نے خفیہ طور پر ایک امیر زادی سے شادی کر لی تھی۔ جب جلال الدین کی بیٹی کو اس کا علم ہُوا تو اُس نے ایک دن علاؤالدین کے سامنے اُس کی دوسری بیوی کی خوب پٹائی کی۔ بادشاہ کی ملکہ یعنی علاؤالدین کی ساس کو بہت غصّہ آیا اور اُس نے علاؤالدین کی خوب بے عزّتی کی۔

علاؤالدین نے چند مہمّات پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ملک چھجّو کی بغاوت کو کامیابی سے کچل ڈالا۔ اس طرح بادشاہ اس سے بہت خوش اور مرعوب تھا۔ علاؤالدین ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد اُس نے ودیشہ، بھلسہ، چندیری اور دیوگری کی امیر ریاستوں کو فتح کر لیا۔ بقول فرشتہ صرف دیوگری سے علاؤالدین کو چھ سو من سونا، ایک ہزار من چاندی، سات من موتی، دو من ہیرے اور دیگر جواہرات اور چار ہزار ریشمی کپڑے کے تھان تاوان کی صورت میں ملے تھے۔ رام چندر راجہ دیوگری نے علاؤالدین کے عقد میں اپنی حسین لڑکی بھی پیش کر دی جو بعد میں شہاب الدین عمر خلجی کی ماں بنی۔

اُدھر سلطان جلال الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں اپنی فوج سمیت گوالیار پہنچا۔ وہیں سلطان کو علاؤالدین کی فتوحات اور بے شمار دولت کے بارے میں علم ہُوا۔ وہ بہت خوش تھا مگر چند اُمراء اور درباریوں نے اُسے علاؤالدین کے خلاف بھڑکایا کہ اُس نے بغیر اجازت دکن کے علاقے پر حملہ کیا تھا اور یہ کہ علاؤالدین اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے والا ہے۔ بعض اُمراء نے علاؤالدین کو بے ضرر اور وفادار بتایا۔ سلطان جلال الدین بھی اپنے بھتیجے اور داماد کو وفادار سمجھتا تھا، اس لیے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ علاؤالدین کو اُس کی شاندار فتوحات پر مبارک باد دینے بذاتِ خود جائے گا مگر علاؤالدین نے اپنے بھائیوں اور وفادار سالاروں کے مشورے سے سلطان جلال الدین کو قتل کرنے

کا منصوبہ بنا لیا کیونکہ اُسے افواہیں موصول ہو رہی تھیں کہ سلطان اُسے قتل کروانا چاہتا ہے، اس لیے کہ علاؤالدین کی فتوحات نے اُسے طاقت ور اور دولت مند بنا دیا تھا۔

سلطان دریا کے راستے بذریعہ کشتی چند محافظوں اور اُمراء کے ساتھ علاؤالدین کی ملاقات کے لیے آیا۔ کشتی میں سے اُس نے علاؤالدین کی فوج کو لڑائی کے انداز میں تیار پایا۔ سلطان کو بتایا گیا کہ فوج اُس کی تعظیم اور استقبال کے لیے تیاری کی حالت میں ہے۔ سلطان کو کچھ شک گذرا اس لیے اُس نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی اور باقی اُمراء اور محافظ بھی سورۃ یٰسین کی تلاوت کرنے لگے۔ کشتی کنارے پر رُکی۔ علاؤالدین خلجی آگے بڑھا اور سلطان کے قدموں میں گر پڑا۔ سلطان نے خوش ہو کر اُسے اٹھایا اور یقین دلایا کہ وہ اُسے بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے۔ سلطان اُس کا ہاتھ پکڑ کر کشتی کی جانب لے جانے لگا مگر پشت سے سلطان پر پے در پے تلواروں کے کئی وار ہُوئے اور وہ تمام فوج کے روبرو قتل کر دیا گیا۔ سلطان کے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

ابھی سلطان جلال الدین کا خون سرد بھی نہ ہُوا تھا کہ علاؤالدین کے سر پر تاج رکھا گیا اور یوں جمعہ کے روز ۲۰ جولائی ۱۲۹۶ء (۱۷ رمضان المبارک) علاؤالدین اپنے نیک اور شفیق چچا کو قتل کروا کر خود سلطان بن گیا۔ علاؤالدین نے محض قتل پر ہی اکتفا نہ کیا تھا بلکہ سلطان جلال الدین کا کٹا ہُوا سر نیزے پر اُڑس کر تشہیر کے لیے جگہ جگہ بھجوایا گیا۔ علاؤالدین نے اُمراء و زراء، سالاروں اور فوج کے مختلف عہدیداروں میں انعامات اور منصب تقسیم کیے۔ خوشی سے دولت لٹائی اور خوب جشن منایا اور اس طرح بہت جلد علاؤالدین خلجی نے مضبوطی سے قدم جما لیے۔

جلال الدین خلجی کے وفادار اُمراء اور سالاروں کو تابع کرنے کے بعد علاؤالدین مزید فتوحات کی جانب متوجّہ ہُوا۔ ملتان، جیسلمیر اور دوسرے کئی علاقے فتح کرنے کے بعد اُس کے سپہ سالار نے گجرات کا ٹھیا واڑ فتح

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کر لیا۔ گجرات کا راجہ کرن شکست کھا کر بھاگ گیا مگر اُس کی حسین رانی کملا دیوی کو بے شمار دولت کے ساتھ سلطان علاؤالدین خلجی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے اُس کو عقد میں لے لیا۔ اس کے بعد اُس کی فوجوں نے رنتھمبور اور دوسرے کئی علاقے فتح کر لیے۔ وہاں سے بھی بے شمار دولت اکٹھی کی گئی۔ بیشتر مہمات راجپوت حکمرانوں کے خلاف تھیں۔ راجپوتانہ کا بیشتر علاقہ فتح ہو چکا تھا مگر چتوڑ کا مضبوط قلعہ اور علاقہ ابھی باقی تھا۔

۲۸ جنوری ۱۳۰۳ء کو سلطان علاؤالدین فوج کے ساتھ چتوڑ کی طرف روانہ ہُوا۔ حضرت امیر خسروؒ بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ چتوڑ ریاست میواڑ کا صدر مقام تھا۔ اجمیر سے ۱۱۶ میل اور اندور سے ۱۹۱ میل پر واقع ہے۔ قلعہ چتوڑ ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس قلعے کی لمبائی چوڑائی ۳½ × ۱½ میل تھی۔ قلعہ پانچ سو فٹ بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعے کا گھیر آٹھ میل تھا جس کے گرد بلند اور مضبوط دیوار تھی۔ اسے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

چتوڑ کا حکمران رانا رتن سنگھ راجپوت تھا جو ہندوستان کے تمام راجاؤں اور حکمرانوں میں بہادری، امارت اور ذات کی بنا پر بلند درجہ رکھتا تھا۔ قلعے کے اندر بہت زیادہ تعداد کی فوج موجود تھی اور سامانِ رسد، خوراک اور اسلحہ وغیرہ بھی ایک سال تک کے لیے کافی تھا۔ سلطان علاؤالدین نے قلعے کا محاصرہ کر کے تمام راستے کاٹ دیئے اور قلعے کی دیواروں کو توڑنے کے لیے منجنیقیں استعمال کیں۔ راجپوت بہادری سے لڑتے رہے۔ تقریباً سات ماہ کی لڑائی کے بعد ۲۶ اگست ۱۳۰۳ء کو قلعہ بند فوج نے بھاری نقصان کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لڑائی میں تقریباً تیس ہزار راجپوت بمعہ رانا رتن سنگھ کے اور بیشتر سالار اور اُمراء مارے گئے تھے۔ لڑائی کے آخری دن رانا رتن سنگھ کی حسین رانی پدمنی بے شمار عورتوں کے ساتھ ستی ہو گئی یعنی اُس نے ان تمام عورتوں کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا ڈالا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ، عبداللہ ملک اسامی اور کئی ہم عصر ہندو مؤرخین

کے مطابق رانا رتن سنگھ نے بذاتِ خود علاؤالدین کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے اور اُس کی جان بخشی کر دی گئی تھی مگر رانا رتن سنگھ کو ازحد ذلت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ علاؤالدین نے ہر شہر میں اُسے لوگوں کے سامنے قیدی کی حیثیت سے پیش کیا۔ اُسے تمام دولت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ہندو مؤرخین نے رانا رتن سنگھ کی جان بخشی کروانے کی التجا کو بزدلی بتایا ہے۔ اُسے میدانِ جنگ میں مر جانا چاہیئے تھا۔ جہاں تک امیر خسروؒ، ضیاالدین برنی اور دوسرے ہمعصر مؤرخین (جن میں ہندو بھی شامل ہیں) کا تعلق ہے انہوں نے پدمنی اور علاؤالدین کے مشہور قصے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ پدمنی اور علاؤالدین خلجی کے بارے میں ایک رومانی نظم مسلمان شاعر ملک محمد جیسی نے ۱۵۴۰ء میں لکھی تھی۔ یعنی چتوڑ فتح ہونے کے ۲۳۷ سال بعد۔ پہلی مرتبہ پدمنی کا قصہ سُنا اور پڑھا گیا۔ سلطان علاؤالدین کو فوت ہوئے ۲۲۴ سال گذر چکے تھے۔ اس عرصے میں کسی مؤرخ یا شاعر نے اُس کے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا۔ ملک محمد جیسی نے چتوڑ پر حملے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ علاؤالدین چتوڑ کی حسین رانی پدمنی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بقول محمد جیسی چتوڑ کی رانی پدمنی پدماوتی لنکا کی شہزادی تھی۔ چتوڑ کے رانا رتن سنگھ کو پدمنی کی خوبصورتی کے بارے میں ایک طوطے سے معلوم ہُوا تھا۔ پدمنی کو حاصل کرنے کے لیے رانا رتن سنگھ نے ایک سادھو گداگر کا رُوپ دھارا اور پدمنی کے محل کے نواح میں بارہ سال تک گھومتا رہا۔ اس طرح پدمنی بھی اس کی طرف مائل ہو گئی اور اس کے ہمراہ چتوڑ آ گئی۔ ایک مرتبہ ایک اور سادھو رگھوا نے بھیک مانگتے ہوئے پدمنی کو دیکھا تھا جس نے جا کر علاؤالدین خلجی کو بتایا کہ چتوڑ کی رانی نہایت حسین ہے جس کا مقابلہ کوئی عورت نہیں کر سکتی اور یہ کہ وہ شاہی حرم کا ہیرا ہو گی۔

سلطان نے رانا رتن سنگھ والیٔ چتوڑ کو حکم بھیجا کہ پدمنی کو شاہی حرم میں بھیجا جائے۔ رانا کے انکار پر سلطان نے چتوڑ پر حملہ کر دیا مگر مسلسل آٹھ سال لڑائی کے بعد بھی چتوڑ کا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ سلطان نے قلعے کی مضبوطی کے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پیشِ نظر اپنا مطالبہ ترک کر دیا مگر رانا سے التجا کی کہ پدمنی کی صرف ایک جھلک اُسے آئینے میں دکھا دی جائے۔ رانا رتن سنگھ مان گیا۔ پدمنی کا عکس دیکھنے کے بعد سلطان نے رانا کو بہانے سے قید کر لیا اور اُسے دہلی لے گیا۔ سلطان نے دہلی پہنچ کر اہلِ چتوڑ کو حکم بھیجا کہ رانی پدمنی کو سلطان کے حوالے کیا جائے تبھی رانا رتن سنگھ کو آزاد کیا جائے گا۔ قیدی راجہ کو بہت اذیت دی جا رہی تھی۔ اسی اثنا میں چتوڑ کی ایک قریبی ریاست کے راجہ دیو پالا نے پدمنی کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہُوا۔

رانی پدمنی عقل مند بھی تھی۔ اُس نے دہلی جانا منظور کر لیا کیونکہ اُس نے رانا رتن سنگھ کو آزاد کرانے کے لئے ایک ترکیب تیار کر لی تھی، مگر اپنے ہمراہ وہ ۶۰۰ پالکیاں سامان سے بھری ہوئی لائی جن میں دراصل چتوڑ کے بہادر راجپوت جنگجو سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ دہلی پہنچ کر پدمنی نے سلطان سے استدعا کی کہ وہ رانا رتن سنگھ سے آخری ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ اُسے اجازت دے دی گئی۔ جونہی پدمنی کے ہمراہ آئی ہوئی پالکیاں محل کے اندر داخل ہوئیں تو اُن میں سے بہادر راجپوت تلواریں نکال کر باہر آ گئے اور فوراً رانا رتن سنگھ کو قید سے آزاد کرا کر بمعہ رانی پدمنی سلطان کی فوج سے لڑتے ہوئے چتوڑ پہنچ گئے۔ سب سے پہلے رانا رتن سنگھ نے راجہ دیو پالا کے علاقے پر حملہ کیا اور اُسے قتل کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا، مگر دیو پالا کے علاقے پر حملے کے دوران رانا رتن سنگھ زخمی ہو گیا تھا اور زخموں کی وجہ سے مر گیا۔ اس کے مرنے پر رانی پدمنی نے آگ میں کُود کر ستی کی رسم ادا کی اور یوں پدمنی بھی بہادری کی موت مر گئی۔

ملک محمد جیسی کی اس فرضی رُومانی داستان کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور بہت جلد یہ تمام ملک میں اشتیاق سے پڑھی جانے لگی پھر یہ داستان نسل در نسل پھیلتی گئی جسے بے شمار شاعروں اور مورخین نے نقل کیا اور زیبِ داستان کے لیے اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ ہندو شاعروں اور مورخین نے سلطان علاؤالدین کی ہندوؤں کے خلاف فتوحات کی شہرت کو

زک پہنچانے کے لیے اُسے عیاش اور ہندوؤں کا دشمن بنانے اور راجپوتوں کی بہادری اور رسم ستی کو بلند مقام دینے کے لیے اس فرضی داستان کو بالکل اصل بنا ڈالا۔ اس فرضی داستان کو فرشتہ جیسے عظیم مؤرخ اور اس کے ہم عصر مورخ حاجی الدبیر نے بھی جگہ دی ہے۔ ان مورخین نے ملک محمد جیسی کی داستان کے ستر سال بعد اپنی تاریخی کتابیں لکھی تھیں، اس لیے آنے والے مورخین نے اس داستان کو مستند قرار دیا۔

راجپوتوں کی بہادری کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے مشہور انگریز مورخ کرنل ٹوڈ نے بھی پدمنی کے قصے کو درست قرار دیا ہے اور ملک محمد جیسی کی داستان کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے مگر کسی بھی مورخ نے چتوڑ کے محاصرے کو آٹھ سال نہیں بتایا۔ بقول فرشتہ وغیرہ چتوڑ کو سلطان نے دوبارہ فتح کیا تھا۔ ایک مرتبہ محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا اور پھر سلطان نے چتوڑ فتح کرنے کے بعد اسے ولی عہد شہزادہ خضر خان کے سپرد کر دیا اور خود واپس دہلی چلا گیا تھا۔ فرشتہ اور دوسرے ہم عصر مورخین لکھتے ہیں کہ رانا رتن سنگھ چتوڑ کے فتح ہونے کے بعد سلطان کی قید میں تھا۔ سلطان نے پدمنی کی خوبصورتی سے مرعوب ہو کر اُسے شاہی حرم میں شامل کرنے کے لیے رانا رتن سنگھ کی قید سے آزادی کے لیے شرط رکھی تھی۔ رانا رتن سنگھ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ یہ شرط مان لے۔ رانا رتن سنگھ کی ایک بیٹی نے اپنے باپ کو آزاد کرانے کے لیے پالکیوں میں سینکڑوں جنگجو راجپوتوں کو چھپا کر سلطان کے محل میں بھجوا دیا اور انہوں نے رانا رتن سنگھ کو آزاد کرا لیا۔ رانا پھر چتوڑ پہنچا اور سلطان کی فوج پر بار بار حملے کر کے اُسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ سلطان نے مجبور ہو کر چتوڑ کا قلعہ رانا رتن سنگھ کے ایک بھانجے کے سپرد کر دیا۔

حاجی الدبیر نے لکھا ہے کہ چتوڑ فتح ہونے کے بعد سلطان نے اُسے رانا رتن سنگھ کی ایک بھانجی کے سپرد کر دیا جس کی ماں سلطان علاؤالدین کے عقد میں تھی مگر علاؤالدین کے ہم عصر مورخین حضرت امیر خسروؒ اور ضیاالدین برنی نے ایسے کوئی واقعات نہیں لکھے۔ رانا رتن سنگھ کا بارہ سال تک اپنے علاقے سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

باہر رہنا اور سادھو گدا گر بن کر لنکا جا کر پدمنی کو حاصل کرنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں حکمران چند ماہ بھی پایۂ تخت سے دُور نہیں رہتے تھے کیونکہ اُن کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر کئی حریف اور وارث تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اُبھر آتے تھے۔ اس کے علاوہ پدمنی یقیناً تیس سال سے اُوپر تھی جب لنکا سے لاکر رانا رتن سنگھ نے اُسے اپنی بیوی بنایا تھا۔ جب سلطان علاؤالدّین نے اُسے آئینے میں دیکھا تب پدمنی کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ یا اُوپر تھی۔ بہرحال پدمنی کا قصّہ ایک افسانہ ہے اور سلطان علاؤالدّین کا اس میں ملوّث ہونا سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ بعد کے ہندو مؤرخین نے تعصّب پھیلانے اور راجپوتوں کی بہادری کے کارنامے اُجاگر کرنے کے لیے اور مسلمان حکمرانوں کو بدنام کرنے کے لیے اس قصّے کو بہت اہمیّت دی اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر خاص طور پر کیا۔ آزادی کے بعد کے کئی ہندو مؤرخین نے اس قصّے کے بارے میں بہت تحقیق کے بعد ثابت کر دیا ہے کہ پدمنی اور سلطان علاؤالدّین کا قصّہ من گھڑت ہے۔ بیشتر مؤرخین نے (جن میں ہندو بھی شامل ہیں) سلطان علاؤالدّین کے بارے میں تصدیق کی ہے کہ اُسے حرم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ اُسے شادی کرنے اور خوبصورت عورتوں کو اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ اگر وہ عیاش ہوتا تو اتنی فتوحات کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی پسندیدہ بیوی مہرو تھی۔ اس کے علاوہ راجہ کرم دیو کی بیٹی کملا دیوی بھی اُس کی بیوی تھی جو اُسے پسند تھی۔

مرتے باپ کی بددُعا

تنجور کے بڈھے مہاراج ادھیراج راجہ شیواجی کے چہرے پر موت کی نقاہت اور زردی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ انت اور انجام کا لمحہ قریب آگیا تھا۔ سانس اُکھڑ رہی تھی۔ محل کے کمروں سے رونے اور بَین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مہاراجہ شیواجی کو یہ علم نہ ہو سکتا تھا کہ رونے والی بیشتر عورتیں اُس کی طرف بڑھتی ہوئی موت کے صدمے اور غم میں بَین کر رہی ہیں یا اپنی بے بسیوں پر آنسو بہا کر نالہ و فریاد کر رہی ہیں۔

راجہ شیواجی نے تنجور کے تخت پر چالیس برس تک بیٹھ کر اس طرح حکومت کی تھی کہ کوئی اس کے حکم کی سرتابی کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کسی میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ اُس کی اجازت کے بغیر پَر مار سکتا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ پیدا ہوتے ہی جیسے اُس کے کان میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ وہ راجکمار ہے اور اُسے اتنی بڑی ریاست کا وارث اور اِن لاکھوں انسانوں کا آقا ہے۔ اُس نے ہوش سنبھالا تو خدّام اُس کے جلو میں رہتے اور اس کی خوشنودی کا پُورا خیال رکھتے تھے۔ اُس کے دل میں یہ بات پختہ ہو گئی کہ وہ ان سب کا مالک ہے، سب سے برتر ہے اور یہ سب حقیر اور نیچ ہیں۔ اُس نے ان ملازموں پر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے۔ کسی کو لات مارتا، کسی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کوتمانچہ، کسی کو مُرغا بنا دیتا۔ کسی کی عزّت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی تھی۔ بڑے بڑے درباری بھی اس سے پناہ مانگنے لگے۔ وہ جس کو چاہتا ذلیل کر دیتا۔ وہ سب اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے راجکمار شیواجی کی جو ہونے والا راجہ تھا، ہر سلوک اور ہر گستاخی برداشت کریں۔

راجہ شیواجی کے باپ نے اُس کو تعلیم دلوانے کے لیے بڑے بڑے نامی استادوں کو جمع کیا لیکن شیواجی کو علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت سے شریف استاد تو اپنی عزّت بچا کر کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ اسے پڑھانے میں لگے رہے مگر ان کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

جب شیواجی کی عمر پندرہ برس ہوئی تو وہ محل کی خوبصورت باندیوں، کنیزوں اور دربار کے عملے کی خوبصورت بیویوں اور بیٹیوں میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس نے ساری عمر انہی نازک اور گرم آغوشوں میں پرورش پائی تھی۔ جب وہ جوان ہُوا تو وہ ان سب پر اپنا حق جتانے لگا۔

اندھی جوانی بے لگام ہو گئی، پھر اس جوانی کو راج کا نشہ بھی چڑھا ہُوا تھا۔ وہ ریاست تنجور کا راجکمار تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ کو اپنی رنگ رلیوں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ ریاستوں کے راجے مہاراجے اسی طرح حکومت کیا کرتے تھے۔ راجکمار شیواجی کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ جوانی کا گرم خون اور ریاست کی ملکیت، ان دونوں نشوں نے مِل جُل کر اس کو عصمتوں کا لٹیرا بنا دیا۔ اس کے ذاتی ملازم اس کی خوشنودی کے لیے ریاست کے اندرونی علاقوں سے اس کے لیے خوبصورت لڑکیاں خرید کر اور اغوا کر کے لانے لگے۔

جب وہ انیس برس کا ہُوا تو اس کا باپ مر گیا۔ اب وہ رسم اور قانون کے مطابق ریاست تنجور کا والی اور راجہ تھا۔

انیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ ختم ہو چکا تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات بڑے خراب تھے۔ ریاستوں کے راجے اور نواب مطلق العنان تھے لیکن ان کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں۔ السٹ انڈیا کمپنی کا

تسلّط اور پھیلاؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انگریزوں کی اس کمپنی نے مختلف حربوں اور بہانوں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر اپنی بالادستی قائم کر دی تھی۔ اپنے راستے کے کئی روڑے اور حریف ایسٹ انڈیا کمپنی نے صاف کر دیئے تھے۔ ہندوستان ایک ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں سے غلامی کا دور شروع ہونے والا تھا۔ مغل سلطنت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ حکومت اور اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

تنجور کی ریاست کے حالات بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے مختلف نہ تھے۔ رعایا غریب، بے بس، راجہ کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھی۔ کسی کو راجہ کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ لوگ راجہ کے مرنے پر خوش نہ ہوتے کیونکہ وہ راجکمار کے لچھن اُس کے بچپن اور لڑکپن ہی میں دیکھ چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مہاراجہ شیواجی اپنے باپ سے بھی زیادہ عیاش، ظالم اور بدکار ہو گیا ہے لیکن لوگ کیا کر سکتے تھے؟ ان کے بس میں کچھ نہ تھا، نہ وہ فریاد کر سکتے تھے نہ وہ انصاف طلب کر سکتے تھے کیونکہ جس کے سامنے فریاد کی جا سکتی تھی اور جس سے انصاف طلب کیا جا سکتا تھا وہ خود ظالم اور بدکار تھا۔

انیس برس کی عمر میں شیواجی ریاست تنجور کا والی بنا تو ساری ریاست میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ چراغاں کیا گیا۔ لوگوں میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں لیکن ان سارے ہنگاموں اور دھوم دھڑکوں کے باوجود لوگ خوش نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان روشنی کے چراغوں میں ان کا خون جل رہا ہے اور جو مٹھائیاں ان میں تقسیم کی گئی ہیں ان کی بھاری قیمت جلد ہی اُن سے وصول کر لی جائے گی۔

شیواجی جب راجکمار تھا تو اُس وقت بھی وہ فضول خرچ اور عیّاش تھا۔ ریاست کا مطلق العنان راجہ اور مالک بن گیا تو اس کی عیاشی اور فضول خرچی کی کوئی حد نہ رہی۔ دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے جن کی عمر ظلم و ستم کرتے اور داد عیش دیتے گزری تھی وہ بھی محسوس کرنے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لگے کہ یہ کل کا لونڈا اُن سے بھی آگے جا رہا ہے اور ان سے بھی بڑا عیاش ہے۔ راجہ شیواجی کو ریاست کے امور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے یہ کام اپنے ایک دیوان نندلال کو سونپ دیا تھا۔ نندلال لومڑی کی طرح مکّار اور چالاک برہمن تھا۔ راجہ شیواجی کا حکم تھا کہ ریاست کا خزانہ ہمیشہ بھرا رہنا چاہیے اور نندلال نے اس کے حکم کی پُوری طرح تعمیل کی بلکہ اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے خود بھی دولت سے گھر بھر لیا تھا۔ ریاست کی رعایا پر نئے نئے ٹیکس لگا دیئے گئے۔ جھگڑوں اور مقدموں کے فیصلے کرتے وقت ریاست فریقین سے نہ صرف یہ کہ شاہی خزانے کے لیے خطیر رقم بلکہ رشوت بھی لیتی تھی۔ راجہ شیواجی کو ان معاملوں سے کوئی غرض نہ تھی کہ اُس کے اعلیٰ افسر اور محکمے کیا کر رہے ہیں۔ وہ عیش و عشرت میں گم ہو گیا تھا۔

اُس کی عیاشی اور بدکاری کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ لکھنؤ، کلکتہ اور دہلی جیسے بڑے شہروں کی طوائفیں اور ڈومنیاں قسمت آزمائی کے لیے تنجور کا رُخ کرنے لگیں۔ تنجور کے راجہ شیواجی کے حکم سے ایک خاص شاہی مہمان خانہ تعمیر ہُوا۔ اس میں راجہ شیواجی کے ان حسین مہمانوں اور ان کے لواحقین کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

چوبیس برس کی عمر میں راجہ شیواجی کے دیوان اور درباریوں نے مشورہ دیا کہ اُسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ راجہ شیواجی نے اس مشورے کا مذاق اُڑایا اور کہا کہ وہ آزاد پنچھی ہے۔ شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیوان اور درباریوں نے کہا کہ ریاست کو ایک راجکمار کی ضرورت ہے اور رعایا کی بھی یہی خواہش ہے۔ رعایا کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔

راجہ شیواجی نے اپنی زندگی میں جس بات کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سوچا وہ یہی بات تھی۔ اُس نے سوچا کہ واقعی ریاست کو ایک راجکمار چاہیے۔

ریاست تنجور ایک بڑی ریاست ہے۔ میرے بعد میرا نام اسی طرح زندہ رہ سکتا ہے کہ میرا ایک بیٹا ہو۔ ملکیت کے شدید احساس نے اس عیاش راجہ کو شادی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ راجہ شیواجی نے دوسرے دن اپنے دیوان کو حکم دیا کہ اُس کے لیے کوئی ایسا رشتہ تلاش کیا جائے جو راج محل کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہو۔

دیوان نندلال نے اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنایا۔ راجہ کی شادی کسی راجے کی بیٹی سے ہو سکتی ہے۔ اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی ایک فہرست تیار کی۔ پھر یہ دیکھا کہ کس ریاست کے راجے کی کتنی بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے کتنی ایسی ہیں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہیں اور وہ کیسی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے اُس نے اپنے ہرکارے ان ریاستوں میں بھجوائے۔ ایسی عورتیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، ان کو ان ریاستوں میں بھجوا دیا گیا تاکہ وہ ان شہزادیوں اور راجکماریوں کو دیکھ کر بتا سکیں کہ اُن کی صحیح عمریں کیا ہیں۔ اُن کے خدوخال کیسے ہیں۔

مختلف ریاستوں کی راجکماریوں کے بارے میں تفصیلی رپورٹیں دیوان نندلال کو ملنے لگیں۔ آخری فیصلہ تو راجہ شیواجی کو ہی کرنا تھا لیکن وہ اپنے طور پر ہر طرح کی معمولی سے معمولی معلومات بھی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب راجہ شیواجی کو اُس کے ایک خاص آدمی نے بتایا کہ تنجور ریاست کے ایک گاؤں میں ایک مسلمان لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ اُسے صرف اور صرف راجہ شیواجی کی خوابگاہ کی زینت بننا چاہیے۔ اس دلال نے اس مسلمان لڑکی کی خوبصورتی کی تعریف کچھ اس انداز سے کی کہ راجہ شیواجی نے حکم دیا کہ اس لڑکی کو اُس کے محل میں لایا جائے۔ ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ لڑکی پر سختی نہ کی جائے۔ اس کے گھر والوں کو خرید لیا جائے۔ یہ حکم بھی صادر ہُوا کہ لڑکی کے گھر پر اس طرح پہرہ لگا دیا جائے کہ گھر والوں کو علم نہ ہو۔ راجہ شیواجی یہ نہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دُوسرا مرد چھُو بھی سکے۔

ریاست تنجور ہندوؤں کی ریاست تھی۔ مسلمانوں کی آبادی ریاست میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ مسلمان مجبوری کے عالم میں وہاں رہتے تھے۔ اپنی چھوٹی بڑی زمین کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جا سکتے تھے۔ تنجور کے اس چھوٹے سے گاؤں میں چند مسلمان گھرانے تھے۔ ان میں ایک گھرانہ نذیر بیگ کا تھا۔ یہ مغل تھے لیکن حالات کے ہاتھوں مجبوراً زمینداری کرتے تھے۔ انہوں نے راجے کی فوجی ملازمت ترک کر دی تھی۔ ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ہندو راجہ کی چاکری کریں۔ نذیر بیگ کا ایک بیٹا تھا مجید بیگ اور ایک بیٹی تھی حمیدن۔ حمیدن کی عمر اُس وقت سولہ سترہ برس تھی۔ اُس کے والدین کو اُس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ کسی موزوں رشتے کی تلاش میں تھے۔ حمیدن بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھی۔ قدرت نے اُسے بلا کا حُسن بخشا تھا۔ وہ سخت پردے کی پابند تھی۔ گھر سے کبھی نہ نکلی تھی لیکن اس کی خوبصورتی کا چرچا گاؤں میں ہوتا ہُوا اب راجہ شیواجی تک جا پہنچا تھا۔

راجہ کا ہرکارہ جب نذیر بیگ سے ملا تو نذیر بیگ ایک ہندو کی زبان سے اپنی بیٹی کا نام سُن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے راجہ کے سرکاری گماشتے کے مُنہ پر تھپڑ دے مارا۔ راجہ کا گماشتہ ناراض تو بہت ہُوا لیکن اُسے راجہ کا حکم پورا کرنا تھا۔ وہ نذیر بیگ کو دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ راجہ سے جا کر سارا ماجرا بیان کرے گا اور راجہ شیواجی اپنے سپاہی بھیج کر حمیدن کو اغوا کرلیں گے۔

نذیر بیگ گھر میں داخل ہُوا تو وہ کانپ رہا تھا۔ راجہ شیواجی کی بدکاریوں اور ظلم وستم کی داستانیں وہ سُن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب قہر نازل ہونے والا ہے۔ مغل خون جوش میں آچکا تھا لیکن ہاتھ پلّے کچھ نہ تھا۔ وہ اکیلا راجہ کی طاقت سے ٹکرا نہ سکتا تھا۔ بیوی نے اُس کو پریشان دیکھ کر بہت کریدا۔ بہت پُوچھا لیکن نذیر بیگ نے اُسے کچھ نہ بتایا۔ جب شام ہو گئی تو اُس نے

اپنی بیوی اور جوان بیٹے کو علیحدہ لے جا کر ساری بات سُنا دی۔ بیوی اور بیٹے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ راتوں رات ریاست سے نکل جائیں۔ جو جمع پونجی زیور تھا اسے ایک پوٹلی میں باندھا اور یہ لوگ اپنے آبائی گھر اور زمین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چل دیئے۔ عزت اور آبرو کے لیے یہ قربانی دینا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ تو گھر سے نکل پڑے لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ اُن کی باقاعدہ نگرانی کی جا رہی ہے۔

جونہی وہ گھر سے نکلے، دو پہریدار اُن کے پیچھے چل پڑے۔ گاؤں کی حدود سے وہ باہر نکلے تو پہریداروں نے انہیں للکارا۔ نذیر بیگ خطرہ بھانپ گیا۔ اُس نے ایک منٹ میں فیصلہ کر لیا۔ بیوی اور بیٹے سے کہا کہ وہ بھاگ نکلیں۔ خود اپنی بیٹی حمیدن کے ساتھ وہ پہریداروں کی بات سننے کے لیے رک گیا۔ اُس نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ پہریدار قریب آ کر حمیدن پر ہاتھ ڈالتے نذیر بیگ نے خنجر نکال کر حمیدن کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ چاند جیسی خوبصورت بیٹی ان کے سامنے خون میں نہا گئی اور دم توڑ گئی۔ نذیر بیگ نے وہی خنجر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی بیوی اور اُس کا بیٹا نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے نذیر بیگ کے مُنہ سے نکلا:

"یا خدا! میں نے اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لیے اپنی بیٹی کی اور اپنی جان دے دی ہے.... میں سرخرو ہُوا۔ میرے خدا میری دُعا ہے کہ یہ بدکار جس ریاست پر غرور کرتا ہے یہ اس سے چھن جائے۔"

نذیر بیگ تو یوں قربانی دے کر سرخرو ہُوا۔ اُدھر راجہ شیواجی غصے میں بھرا ہُوا تھا۔ حمیدن جیسی خوبصورت دوشیزہ اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس نے پہریداروں کو بلایا۔ پہریداروں نے حرف بہ حرف اُس کو بتا دیا اور نذیر بیگ نے مرتے دم جو دعا کی تھی وہ بھی اُسے سُنا دی۔

راجہ شیواجی پر اس بد دُعا کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ اُس نے قہقہہ لگا کر بات کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ایک کان کو سُنا دوسرے کان سے نکال دیا۔

راجہ شیواجی پچیس برس کا تھا کہ اس کی شادی ریاست راجکوٹ کی راجکماری رادھا سے ہوگئی۔ راجکوٹ ریاست کا راجہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اُس کی صرف یہی ایک بیٹی تھی جو اگرچہ زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن اپنے جہیز میں پوری ریاست راجکوٹ لائی تھی کہ راجہ کی موت کے بعد اُسے ہی ریاست کو سنبھالنا تھا اور اُس کے بیٹے کو ہی ریاست تنجور اور ریاست راجکوٹ کا ایک دن راجہ بننا تھا۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ راجوں نوابوں نے اس میں شرکت کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بھی ایک نمائندہ شادی میں شریک ہُوا۔ اُس سستے زمانے میں لاکھوں روپے اس کی شادی پر لُٹا دیے گئے۔ کئی دنوں تک جشن رہا۔ راجہ شیواجی نے بھی چند دنوں کے لیے دوسری عورتوں سے منہ پھیر لیا۔ اب اُسے اپنے وارث کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کیونکہ راجکوٹ کی ریاست بھی تو اب اُس کی ریاست بن گئی تھی۔

چند دنوں کے بعد شیواجی پھر اپنے پُرانے راستے پر چلنے لگا۔ نذیر بیگ کی بددُعا کو وہ بھول چکا تھا۔ اُس نے اُسے غور سے سُنا ہی نہ تھا۔ راجہ شیواجی تیس برس کا ہوگیا تھا لیکن اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دُنیا بھر کے حکیم، وید اور سیانے بُلائے گئے، حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک انگریز ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو بھی راجہ کی درخواست پر بھیجا لیکن سب نے ایک ہی فیصلہ دیا کہ نہ تو راجہ میں کوئی خرابی ہے نہ ہی اس کی بیوی میں لیکن اولاد پھر بھی پیدا نہ ہو رہی تھی۔

پینتیس برس کی عمر میں راجہ شیواجی کا مزاج بے حد چڑچڑا ہوگیا۔ اولاد کی کمی آسیب بن کر اُس پر سوار ہوگئی۔ شراب تو وہ پہلے بھی پیتا تھا، اب وہ دن رات شراب کے نشے میں دُھت رہنے لگا۔ وہ ایک بیٹے، اپنے ایک وارث کے لیے ترس رہا تھا۔ جب وہ ۳۸ برس کا ہُوا تو اُس کی رانی مرگئی۔ ایک تو وہ اپنے شوہر کی بے رہروی کے ہاتھوں تنگ

تھی، دوسرے اولاد نہ ہونے کے غم نے اُسے روگ لگا دیا تھا۔ وہ تیس برس میں اپنے انجام کو اسی طرح پہنچی کہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔

راجہ شیواجی مایوسی اور غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اب جوانی کا دم خم بھی ختم ہو چکا تھا۔ شراب کی زیادتی نے اس کی صحت کو گھُن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا اور وہ اب اپنی صحت سے بھی مایوس ہو رہا تھا۔ وارث نہ ہونے کے دُکھ نے اس کی زندگی میں زہر بھر دیا تھا۔

دیوان نندلال کا گھر دولت سے بھرتا جا رہا تھا۔ راجہ شیواجی تو نام کا راجہ رہ گیا تھا۔ دیوان نندلال کایاں اور محتاط برہمن تھا۔ وہ راجہ کا وفادار تھا اور اُس کا تاعمر وفادار رہا۔ اُس نے راجہ کے خلاف کوئی سازش نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ راجہ نہیں بن سکتا، اس لیے جتنی دولت جمع کر سکتا ہے اتنی جمع کر لینی چاہیے۔ اُس نے دولت کی کمی کو پُورا کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ریاست کے بیرونی امور کے کچھ ٹھیکے دے دیئے۔ ایک بھاری رقم قرض لے کر خود ہڑپ کر گیا اور اُسے ریاست کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اب ریاست تنجور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط بڑھنے لگا۔

راجہ شیواجی کو شراب نوشی کے باوجود اولاد کا غم کھا رہا تھا۔ دیوان نندلال نے کہیں سے ایک سادھو کو تلاش کر لیا جس نے راجہ شیواجی کو ملاقات کے دوران بتایا کہ راجہ کے گھر ایک ہی صورت میں اولاد ہو سکتی ہے۔ اس سادھو نے جو کچھ بتایا راجہ شیواجی اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ سادھو کو دل کھول کر نذر نیاز دے کر رخصت کر دیا گیا۔ راجہ شیواجی نے دیوان نندلال کو حکم دیا کہ سادھو نے جو کچھ بتایا ہے اس کو پُورا کرنے کی تیاریاں کی جائیں۔

راجہ شیواجی کی عمر اب چالیس برس ہو چکی تھی۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی جگہ انوکھا اور منفرد ہے کہ شیواجی نے ایک ہی دن ستر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لڑکیوں سے شادی کی۔ یہ تاریخ کا ایک سچا اور حقیقی واقعہ ہے جسے کسی طرح بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس سادھو نے راجہ شیواجی کو یہی نسخہ بتایا تھا کہ وہ ایک ہی دن سترہ لڑکیوں سے شادی کرے۔ ان سترہ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اُس کے ریاست کے وارث اور راجکمار کی ماں بنے گی۔

۱۸۴۹ء میں مئی کی اکیس تاریخ کو راجہ شیواجی کے محل میں ایک ایسی تقریب ہوئی جس کی مثال پُوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سترہ جوان خوبصورت، کنواری لڑکیاں ریاست کے گوشے گوشے سے ڈھونڈ کر لائی گئیں۔ ان کی حیثیت بکریوں سے زیادہ نہ تھی جنہیں ایک قصاب کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا۔ یہ سترہ جوان خوبصورت کنواری لڑکیاں سب کی سب ہندو تھیں۔ اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ راجہ نے ان کے والدین کو بھاری انعام دیا تھا اور وہ خود بھی اس لالچ میں آ گئے تھے کہ ان کی بیٹیاں ریاست کے محل میں رانی بن کر راج کریں گی اور ہر لڑکی کے ماں اور باپ یہ سمجھتے تھے کہ اُسی کی لڑکی راجکمار کی ماں بنے گی۔

۲۱ مئی ۱۸۴۹ء کو سہ پہر کے وقت خالص ہندو رسم کے مطابق راجہ شیواجی نے بیک وقت ان سترہ لڑکیوں سے شادی کی۔ راجہ شیواجی کے کُرتے کے ساتھ ہر لڑکی کی ساڑھی کا کونہ باندھا گیا تھا۔ اس طرح ان سترہ لڑکیوں نے بیک وقت ہندوؤں کی رسم کے مطابق آگ کے گرد سات سات پھیرے لیے اور وہ راجہ شیواجی کی بیویاں بن گئیں۔

راجہ شیواجی بیک وقت سترہ بیویوں کا شوہر تھا۔ اُس کی عادات بدل گئیں۔ شراب میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ وہ ایک وحشی بن گیا۔ بیویوں کو گالیاں دیتا کہ وہ جلدی سے ماں بن جائیں۔ وقت گزرتا گیا۔ نو ماہ گزر گئے۔ ایک سال گزر گیا۔ دو سال گزر گئے۔ ان سترہ لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی ماں بننے والی نظر نہ آئی۔ مایوسی، غصّے، بے بسی اور بے چارگی نے راجہ شیواجی کو مجبور کر دیا کہ وہ پھر شراب میں ڈوب جائے۔ اُس کی صحت جواب دے

گئی تھی اور اب ۱۸۵۵ء میں فروری کے مہینے میں وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اُسے سترہ بیویوں کا شوہر بنے چھ برس ہو چکے تھے لیکن ان چھ برسوں میں ایک لڑکی نے بھی ریاست کا راجکمار پیدا نہ کیا۔

محل کے اندر سے ان سترہ بیویوں کے بَین کی آواز آ رہی تھی۔

راجہ شیواجی بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا۔ مرتے مرتے اُسے اچانک یاد آیا کہ ایک بار اُس نے ایک مسلمان کی بیٹی کو اغوا کرانے کی کوشش کی تھی اور اس مسلمان لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کے ساتھ اپنی جان دے کر اُسے بددُعا دی تھی — اب وہ بددُعا پُوری ہو رہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد راجہ شیواجی، تنجور کا آخری حکمران مر گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد — ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست تنجور پر قبضہ کر لیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مارکونی اور مادرِ وطن

رگیستان جو میرے سامنے اور میرے اردگرد پھیلا ہُوا ہے، یہی میری دُنیا ہے، یہی میری زندگی ہے۔ مجھے اسی رگیستان میں مرنا ہے۔ یہ ریت میرے خون کی پیاسی نہیں لیکن میں اسے اپنا خون پلاؤں گا۔ الجزائر کے مجھ جیسے بے شمار بیٹے اس ریگزار کو اپنا خون پلا چکے ہیں۔

یہ رگیستان ہمارا ہے، فرانسیسیوں کا نہیں۔

اپنے وطن کی ریت غیروں کے دیس کے سونے سے زیادہ قیمتی اور مقدّس ہُوا کرتی ہے۔

میں ایسی باتیں نہیں جانتا تھا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ الجزائر میرا وطن ہے اور اس پر فرانسیسی قبضہ کر کے ہمارے بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہماری زمین کی پیداوار کے مالک ہیں، ہماری عزّت اور ہمارے وقار کے مالک ہیں۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری قوم کے بزرگوں اور نوجوانوں نے فرانسیسیوں سے اپنا وطن چھڑانے کے لیے مسلّح جنگ شروع کر دی ہے اور اس جنگ کو ہمارے بادشاہ بغاوت کہتے ہیں اور اس جُرم کی جو سزا دیتے ہیں، جُسے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا باپ عرصہ اڑھائی سال سے گھر سے غائب ہے اور میری ماں کو اس کا کوئی غم نہیں۔ ماں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا باپ اُن لوگوں کے ساتھ چلا گیا ہے جو فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں، کٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رہے ہیں قید ہو رہے ہیں، فرانسیسی پولیس کی اذیتیں سہہ رہے ہیں جو وہی سہہ سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت نہیں عشق ہوتا ہے اور وہ اپنی منڈیر پر اپنا جھنڈا لہرانے کی قسم کھا لیتے ہیں۔

پھر بہت سی باتیں مجھے اپنے باپ نے بتائی تھیں۔ انہیں میں خواب کی باتیں سمجھا تھا، جیسے خواب میں باپ آیا اور میرے خون کو گرما گیا تھا۔ ماں نے دوسرے دن بتایا تھا کہ میرا باپ واقعی آیا تھا۔ یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سال اور شاید دو تین مہینے اُوپر ہو چکی تھی۔ میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ باپ نے مجھے جگایا۔ بڑی مشکل سے میری آنکھیں کھلیں۔ میری ماں باپ کے پاس کھڑی تھی۔ میں باپ کے گلے لگ گیا تھا۔ اُسے میں ایک عرصے بعد دیکھ رہا تھا لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور میرا باپ تیز تیز بول رہا تھا۔ مجھے اُس کے الفاظ یاد ہیں۔ جو یاد نہ رہے وہ ماں نے بتا دیئے تھے۔

مجھے اُس رات پتہ چلا کہ میرا باپ گرفتار ہو گیا تھا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا باپ معمولی آدمی نہیں تھا۔ کسٹم کے محکمے میں افسر تھا۔ فرانسیسی زبان اپنی زبان کی طرح بولتا تھا۔ اُس نے مجھے اُس سکول میں داخل کرایا تھا جس میں افسروں اور امیروں کے بچے پڑھا کرتے ہیں۔ چوتھے سٹینڈرڈ تک بچیاں بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتی تھیں۔ ان میں فرانسیسیوں کی بچیوں کے علاوہ اٹلی، سپین، جرمنی اور انگلینڈ کی بچیاں بھی تھیں اور ان میں الجزائر کی مسلمان بچیاں اور بچے بھی تھے۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں امیر گھرانے کا بچہ تھا اور افسر کا بیٹا۔

اور میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ قوم کے امیر لوگ اور لیڈر اگر یہ سمجھ بیٹھیں کہ بڑا مرنا اور قربانی دینا صرف غریبوں، مزدوروں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں کا کام ہے تو ایسی قوم ہمیشہ بدطینت لوگوں کی غلام اور زبوں حال رہتی ہے۔ ہم اپنے وطن کو آزاد کرائیں گے کیونکہ ہم سب امیر اور غریب، افسر اور ماتحت ایک ہو گئے ہیں۔

میرا باپ حریت پسندوں کی مدد اس طرح کرتا تھا کہ انہیں اسلحہ بارود اور دوسرے جنگی ساز و سامان کی گاڑیوں کے متعلق اطلاعیں دیا کرتا اور انہیں فوجی راز بھی بتایا کرتا تھا۔ چھاپہ مار مجاہدین کے ساتھ اُس کا در پردہ رابطہ تھا۔ ماں نے مجھے بتایا کہ فرانسیسیوں کی خفیہ پولیس کو اُس پر شک ہو گیا اور ایک روز وہ پکڑا گیا۔

چھ مہینوں بعد، ایک رات باپ گھر آیا اور اُس نے مجھے جگایا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اُس نے کہا — "میرے عزیز بیٹے! مجھے بھول جانا، میری باتیں نہ بھولنا۔ ہم شاید کبھی نہ مل سکیں۔ میں قید سے فرار ہو آیا ہوں۔ اب میں اِدھر نہیں آ سکوں گا۔ میں مر جاؤں یا زندہ رہوں، تمہیں اپنے وطن کو آزاد کرانا ہے۔ تمہیں ماں بتا دے گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میری وصیت یاد رکھو۔ ذہن سے اُتار دو کہ تم کسی افسر کے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں جو آسائشیں مہیا کی تھیں، انہیں بھی بھول جاؤ۔ تمہیں ریگستان میں کسی فرانسیسی کی گولی سے یا پیاس سے مرنا ہے لیکن مرنا کوئی بہادری نہیں۔ مار کر مرنے کو بہادری کہتے ہیں.... میں رُک نہیں سکتا۔ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے" — مجھے یاد ہے کہ باپ نے مجھے جھنجھوڑا تھا اور کہا تھا — "جاگ میرے بیٹے، جاگ۔ جس قوم کے نوجوان سو جاتے ہیں اُس قوم کی قسمت سو جاتی ہے۔"

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے ماں سے کہا کہ میں نے خواب میں ابّا کو دیکھا ہے۔ ماں کو میں نے ابّا کی باتیں سنائیں تو ماں نے مسکرا کر کہا کہ وہ آئے تھے، اور وہ جو باتیں کہہ گئے ہیں وہ بھول نہ جانا۔ پھر ماں نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کو ایک جیل سے دوسری جیل میں لے جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ قیدیوں کو رات کو اِدھر اُدھر لے جایا کرتے تھے تاکہ حریت پسندوں کو پتہ نہ چل سکے لیکن اب کے حریت پسندوں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے ویرانے میں قیدیوں کی گاڑی پر حملہ کر دیا۔ چند ایک قیدی مارے گئے۔ اُن کے گارڈوں سے بھی کچھ اور شاید تین چار چھاپہ مار بھی مارے گئے تھے۔ میرا باپ آزاد ہو کر نکل آیا اور مجھے وصیت کر کے چلا گیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میری ماں کے چہرے پر اور اُس کی باتوں میں افسوس اور غم کا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اُس نے مجھے وہ ساری باتیں یاد دلائیں جو باپ رات کو مجھے کہہ گیا تھا۔

"تمہیں بھی اپنے باپ کے پیچھے جانا ہے"۔ ماں نے کہا — "وہ حریت اور شہادت کے راستے پر اپنے نشان چھوڑ گیا ہے۔ یہ نشان تمہاری راہنمائی کریں گے۔ جہاں قدموں کے یہ نشان ختم ہو جائیں گے وہاں سے خون کے قطرے شروع ہوں گے۔ یہ تمہارے باپ کا خون ہو گا۔ قوموں کے بیٹوں کی راہنمائی باپوں کے خون کے قطرے کیا کرتے ہیں۔"

الجزائر پر فرانسیسی میرے پیدا ہونے سے پہلے کے قابض تھے۔ اُس وقت وہ بیویاں کہاں تھیں جو وطن کی آزادی پر اپنے خاوندوں، اپنے سہاگ کو قربان کر دیا کرتی ہیں اور اپنے بچوں کو قربان کرنے والی مائیں کہاں تھیں؟

وہ یہیں تھیں۔ وہ جس مذہب کی بیٹیاں ہیں اس کی روایت کو وہ فراموش کیے بیٹھی تھیں۔ مرد اپنے غیر ملکی بادشاہوں کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ غیر ملکیوں نے یہاں اپنے سکول کھول دیئے تھے جہاں وہ اسلام پر اپنے مذہب کا رنگ چڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔ آخر باپوں کے سینوں میں ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی شمع جل اٹھی۔ بیٹے بیدار ہو گئے۔ ماؤں نے اپنے بچے وطن کی قربان گاہ پر پیش کر دیئے۔ بیویوں نے اپنے سہاگ قوم کے قدموں میں رکھ دیئے۔

اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ ماں مجھے میرے باپ کی باتیں سُنا رہی تھی کہ باہر کسی نے گاڑی کو بریکیں لگائیں۔ ماں کے چہرے پر میں نے گھبراہٹ دیکھی۔ اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "وہ آ گئے ہیں۔"

"کون؟" — میں نے خوشی سے پوچھا — "ابا؟"

"نہیں.... پولیس.... شاید فوجی ہوں گے۔"

ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا نہیں، توڑا جا رہا تھا۔ فرانسیسی زبان میں جو ہم سمجھتے تھے، کسی نے چلا کر کہا — "دروازہ کھول دو، ورنہ ہم اندر گھس

کے گولے پھینکیں گے۔"

ماں غصے سے اُٹھی اور بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ ماں نے دروازہ کھولا تو پولیس کے چار آدمی دوڑتے ہوئے اندر آئے اور کمروں میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمارے گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ برتنوں اور فرنیچر کو ٹھڈ اور رائفلوں کے بٹ مار رہے تھے۔ ہمارے گھر کے چھ کمرے ہیں۔ انہوں نے ہر ایک کمرے میں جا کر سامان تہہ و بالا کر دیا۔ چھت پر گئے اور جب انہیں کچھ نہ ملا تو نیچے آ کر مجھے اور میری ماں کو کھڑا کر لیا۔ میرا خون اُبل رہا تھا۔ میں فرانسیسیوں کو اپنا دشمن تو سمجھتا تھا، لیکن اُس روز مجھے پتہ چلا کہ اس دشمن نے ہماری ذاتی عزت اور ہمارے قومی وقار پر پاؤں رکھا ہوا ہے اور ہم جو ایک سچے اور عظیم مذہب اسلام کے پیرو کار ہیں، ان کفار کے سامنے ذلیل و خوار مخلوق ہیں۔

"وہ کہاں ہے؟" — ایک سارجنٹ نے میری ماں سے گرج کر پوچھا۔

"کون؟"

"تمہارا خاوند" — سارجنٹ نے کہا — "وہ یہاں آیا تھا۔"

"وہ چھ مہینوں سے لاپتہ ہے" — میری ماں نے جواب دیا — "مجھے کچھ پتہ نہیں کہاں ہے۔"

اتنے میں ہمارا ایک پڑوسی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اندر آ گیا۔ اُس کی یہ بیٹی میری ہم عمر ہے۔ اُس وقت ہم دونوں پندرہ سولہ سال کے تھے۔ اُس کا نام مارکونی ہے۔ یہ لوگ اٹلی کے رہنے والے ہیں۔ مارکونی میرے ساتھ چوتھے سٹینڈرڈ تک پڑھتی رہی ہے۔ ہمارے ساتھ اُس کا بڑا لگاؤ تھا۔ اٹلی اور یورپ کے بچے بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے لیکن مارکونی میرے ساتھ بیٹھتی، کھیلتی بھی میرے ساتھ اور ہم دونوں کرائے کی ایک ہی گھوڑا گاڑی پر سکول جایا اور آیا کرتے تھے۔

مارکونی کا باپ محکمۂ خوراک میں افسر تھا اور میرے باپ کا دوست۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مارکونی کی ماں میری ماں کی سہیلی تھی۔ وہ بھی اور ہم بھی آپس میں فرانسیسی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے۔

"آپ لوگ کیا لینے آئے ہیں؟" سارجنٹ نے مارکونی کے باپ سے کہا۔ وہ اُسے یورپی باشندہ سمجھ کر شرافت سے بولا تھا۔

"میں اس خاتون (میری ماں) اور اس کے اس بچّے کی ضمانت دینے آیا ہوں"۔ مارکونی کے باپ نے کہا۔ "اس عورت کا خاوند مجرم اور باغی ہو سکتا ہے، اس عورت کو ہم پندرہ سولہ سال سے جانتے ہیں۔ یہ تو خاوند کی ستائی ہوئی مظلوم عورت ہے۔ اس سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تو بدھو عورت ہے۔"

اُس نے جھوٹ بولا تھا۔ میری ماں میرے باپ کی ستائی ہوئی ہرگز نہیں تھی، اور میری ماں بدھو عورت بھی نہیں تھی۔ یہ اطالوی مجھے اور میری ماں کو ان فرانسیسی درندوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ماں فوراً بدھو بن گئی۔

"آپ یورپی ہیں اس لیے میں آپ کی ضمانت قبول کر سکتا ہوں"۔ سارجنٹ نے کہا۔ "اگر آپ مسلمان ہوتے تو میں ان دونوں کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر کے لے جاتا"۔ سارجنٹ نے بڑی نفرت سے انگلی میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سانپ کا بچّہ ہے۔ اس عمر کے لڑکوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ قیدیوں کی گاڑی کو روکنے اور اس پر حملہ کر کے چھڑانے والوں میں سے پانچ مارے گئے تھے۔ وہ پانچوں سولہ سے اٹھارہ سال عمر کے لڑکے تھے۔ میں نے اُن کی لاشیں دیکھی ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ان بدبخت اور مجرم مسلمانوں کے لڑکوں کو ختم کرنا پڑے گا۔"

میری ماں نے لپک کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اپنے ساتھ لگا کر بدھو اور مظلوم ماں کی طرح گڑگڑا کر کہا۔ "میرا بچّہ ایسا نہیں۔ یہ اپنے باپ پر نہیں جائے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس کا باپ کہیں چلا گیا ہے۔"

"یہ میرا کلاس فیلو رہا ہے"۔ مارکونی نے سارجنٹ سے کہا۔

میری طرف گہری نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ چُپ رہنا ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

میں نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ ان فرانسیسیوں کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ ہمیں ہمارے گھر سے نکال دیں گے۔ میں نے سارجنٹ کو دیکھا۔ وہ پچیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا خوبرو آدمی تھا اور وہ مسکراتے ہوئے مارکونی کو دیکھ رہا تھا۔ مارکونی خوبصورت لڑکی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ زیادہ جوان دکھائی دیتی تھی کیونکہ اُس کا قد لمبا تھا۔ وہ سارجنٹ کو ویسی ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسی نظروں سے وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

مارکونی کی سفارش کام کر گئی۔ سارجنٹ مجھے اور میری ماں کو دھکیاں دے کر مارکونی کے باپ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ سارجنٹ مارکونی کے گھر چلا گیا تھا اور اُس کے سپاہی باہر گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ان یورپینوں میں ہماری طرح شرم نہیں ہوتی۔ کوئی حجاب نہیں ہوتا، لیکن میں نے اس کے متعلّق کچھ بھی نہ سوچا۔ میں جانتا تھا کہ سارجنٹ نے مارکونی کی سفارش کیوں قبول کر لی تھی اور وہ اُن کے گھر کیوں چلا گیا تھا۔ مجھے ایسا افسوس بالکل نہ ہُوا کہ مارکونی کا تو میرے ساتھ لگاؤ تھا اور اب وہ ایک سارجنٹ کو اپنے گھر لے گئی ہے۔ اُس وقت میرا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر کس طرح چل سکوں گا؟ مجھے ٹریننگ کون دے گا؟ مجھے کس سے ملنا چاہیئے؟

ان سارے سوالوں کے جواب مجھے اپنی ماں سے مل گئے۔ اُس نے مجھے پہلا سبق یہ دیا کہ اگر اس طرح پولیس اچانک گھر میں آ جائے تو فوراً بھیگی بلّی بن جاؤ۔ مسکین اور بھکاری بن جاؤ۔ پولیس والے گالیاں دیں تو سر جھکا لو۔ احساس اور جذبات کو سینے میں دبا لو۔

"میں دیکھ رہی تھی کہ پولیس کے سامنے تمہارا چہرہ غصّے سے سرخ ہُوا جا رہا تھا"۔ ماں نے کہا۔ "اگر تم غصّے کا ذرا سا بھی اظہار کر دیتے تو وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

www.paksociety.com

تمہیں پکڑ کر لے جاتے۔ قوم کا ایک نوجوان ضائع ہو جاتا۔ تمہیں اپنے باپ کی طرح زمین کے نیچے سے حملے کرنے ہیں۔ فرانسیسیوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔ فتح ہماری ہوگی۔"

اُس روز کے بعد میں نے کئی بار سارجنٹ کو مارکونی کے گھر آتے دیکھا لیکن مجھ پر اس کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ یہ تو مجھے خود ہی معلوم ہو گیا ہے کہ الجزائر کے نوجوان اگر عورت کے چکّر میں پڑ جائیں تو غلامی کا شکنجہ اور زیادہ سخت ہو جائے گا۔ میں نے سولہ سال کی عمر میں سمجھ لیا تھا کہ ہمارے فرانسیسی حکمران ہمیں ذہنی عیاشی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ میں مارکونی کو انہی نظروں سے دیکھتا رہا جن سے پہلے دیکھا کرتا تھا۔

میری ماں نے میری ٹریننگ کا انتظام کر دیا۔

تین ماہ بعد، ایک روز مارکونی ہمارے گھر آئی اور مجھ سے رازداری سے پوچھا — "تمہارے گھر میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں؟... میرا مطلب ہے کوئی اسلحہ یا ایمونیشن وغیرہ؟"

"میرے گھر میں اسلحہ اور ایمونیشن کہاں سے آسکتا ہے؟" — میں نے قدرے غصّے سے کہا۔

"شمس!" — مارکونی نے کہا — "مجھ سے کچھ چُھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اس میں تمہاری ماں کی عزّت ہے۔ میں جانتی ہوں تم کیا کر رہے ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے فرانسیسی سارجنٹ نے تمہاری فطرت ہی بدل ڈالی ہے" — میں نے طنزیہ کہا — "تم نے مخبری شروع کر دی ہے۔"

"شمس!" — اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا — "میں واقعی مخبری کر رہی ہوں۔ میں تمہیں راز کی یہ بات بتانے آئی ہوں کہ آج رات تمہارے گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑے گا۔ اگر گھر میں کوئی قابلِ اعتراض چیز ہے تو اسے زمین میں دبا دو یا مجھے دے دو یا کہیں اور غائب کر دو۔"

وہ چلی گئی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ مارکونی پر مجھے بھروسہ کرنا چاہیئے یا

نہیں۔ میں نے ماں کو بتایا۔ اُس نے کہا کہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے کسی باشندے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ مارکونی بھید لینے آئی تھی کہ ہمارے گھر میں اسلحہ ہے یا نہیں۔

میرے گھر میں دو خنجر تھے جو فرانسیسی حکومت کے حکم کے مطابق رکھنا جُرم تھا۔ اس کے علاوہ ایک ۳۲ بور کا پستول تھا جس کی میگزین میں گیارہ گولیاں پڑتی ہیں۔ یہ پستول ہمارے گھر میں دس بارہ دن پہلے آیا تھا۔ ایک آدمی لایا تھا جسے میری ماں جانتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ میرے باپ نے میرے لیے بھیجا ہے۔ باپ کی زندگی اب ریگستان میں گذر رہی تھی۔

جس روز مارکونی نے مجھے آکر خبردار کیا تھا، اُسی شام ایک غلیظ سے بھکاری نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آگیا۔ اُس کی داڑھی لمبی اور گندی تھی۔ سر کے بال بھی بہت گندے تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور بدبودار۔ میں نے اُسے اندر آنے سے روکا لیکن وہ اندر کمرے میں آگیا اور ہنس کر بولا — "اگر بیٹے نے مجھے نہیں پہچانا تو فرانسیسی پولیس تو مجھے پہچان ہی نہیں سکے گی۔ میرا بہروپ کامیاب رہا۔"

"آپ کو یہاں نہیں رُکنا چاہیئے" — میں نے باپ سے کہا اور انہیں بتایا کہ مارکونی کی دوستی ایک فرانسیسی سارجنٹ سے ہو گئی ہے اور وہ بتا گئی ہے کہ آج رات ہمارے گھر چھاپہ پڑے گا۔

باپ نے ماں کو کچھ رقم دی اور کہا — "اس لڑکی کا مطلب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مجھے یہاں نہیں رُکنا چاہیئے۔ میں پھر کبھی آؤں گا۔ گھر میں اگر کوئی ہتھیار ہے تو وہ کہیں چُھپا دو۔"

باپ چلا گیا۔ اس سے ایک ہی گھنٹہ بعد ہمارا دروازہ کسی کی دستک سے ٹوٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی چھت پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میری ماں نے دروازہ کھولا۔ پولیس کے تین چار آدمی مشعلیں روشن کیے اندر آگئے۔ دو چھت سے اُترے اور انہوں نے ہمارے گھر کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ میں خنجر اور پستول پودوں کی کیاری میں دبا چکا تھا۔ پولیس نے ہمارے گھر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanpoint

کے سامان کا یہ حال کر دیا جیسے ڈاکہ پڑا ہو۔ اس پارٹی کے ساتھ ایک اور سارجنٹ تھا۔ اُس نے مجھے اور میری ماں کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"تم نے سکول جانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟" — سارجنٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"اسے میں نے سکول سے ہٹا دیا ہے" — میری ماں نے جواب دیا — "آپ کو معلوم ہے کہ اس کا باپ جیل خانے میں پڑا ہے۔ میں اسے کیسے پڑھا سکتی ہوں۔ دوسرا ڈر یہ ہے کہ باہر کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا اکلوتا بیٹا حالات کا شکار ہو جائے۔"

"تمہارا خاوند قید سے فرار ہو چکا ہے" — سارجنٹ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا — "تم اچھی طرح جانتی ہو وہ کہاں ہے اور یہ لڑکا باغیوں کے پاس جاتا ہے۔ اگر اپنے خاوند کا سراغ دے دو تو آرام سے زندگی بسر کر سکو گی۔ اس کے علاوہ اپنے اِس بیٹے پر نظر رکھو۔ اگر یہ پکڑا گیا تو تمہیں ساری عمر نہیں ملے گا۔"

وہ فرعونوں کی سی حرکتیں اور باتیں کر کے چلے گئے۔ ماں بہت دیر تک کھلے ہوئے دروازے کو دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کی سرگوشی سُنی —

"میں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے وطن پر قربان کر دیا ہے۔"

کچھ دیر بعد مارکونی آ گئی اور بولی — "اب تو مجھ پر اعتبار کرو گے شمس! میں فرانسیسی نہیں، اطالوی ہوں۔"

"پھر وہ سارجنٹ تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تم اُس کے ساتھ باہر کیوں جاتی ہو؟"

"میں اس کے ساتھ شادی کر رہی ہوں" — اُس نے جواب دیا۔

"میرے ماں باپ نے مجھے اجازت دے دی ہے.... لیکن میں تمہیں دھوکہ نہیں دُوں گی۔ تم میرے بچپن کے ساتھی ہو۔ تم حق پر ہو۔ میری شادی یک فرانسیسی سارجنٹ کے ساتھ ہو رہی ہے، فرانس کی حکومت کے ساتھ نہیں ہو رہی۔"

اور مارکونی کی شادی اس سارجنٹ کے ساتھ ہو گئی۔ اُس وقت تک میں چوری چھپے تھوڑی سی فوجی تربیت حاصل کر چکا تھا۔ مارکونی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی۔

ایک رات میرا باپ اُسی بہروپ میں آیا جس میں وہ پہلے آ چکا تھا۔ اُس نے میری ماں سے کہا — "میں تمہارے بچے کو لے جا رہا ہوں۔ اِسے خدا حافظ کہو۔ کبھی کبھی میری طرح آ جایا کرے گا۔"

ماں کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے مجھے گلے لگایا، میرا سر اور میرے گال چُومے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی — "اگر تم صرف میرے بیٹے ہوتے تو تمہیں کبھی نہ جانے دیتی مگر تم قوم کے بیٹے ہو۔ مسلمان مائیں اپنے بیٹوں کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتیں۔ ان کے بیٹے خدا کی امانت ہیں.... جا بیٹے! میں تمہیں خدا کے حوالے کرتی ہوں۔"

کوشش کے باوجود میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ میرے باپ نے میری ماں سے کہا — "پولیس آئے اور اس کا پُوچھے تو رو پڑنا اور کہنا کہ میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔"

میں باپ کے ساتھ چلا گیا۔ شہر سے چُھپ چُھپ کر نکلے۔ شہر سے کوئی ایک میل دُور اندھیرے میں ایک آدمی دو اونٹوں کے پاس کھڑا تھا۔ وہ میرے باپ کا ساتھی تھا۔ ایک اونٹ پر باپ نے مجھے اپنے ساتھ سوار کرا لیا اور دوسرے پر وہ آدمی سوار ہو گیا، پھر ہم اُس منزل کو روانہ ہو گئے جہاں میں آج ہوں

آدھی رات کے بعد ہم ایسے علاقے میں پہنچے جہاں مٹی اور ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ بعض ٹیلے ستونوں کی طرح، بعض دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ بعض ایسی شکلوں کے تھے جیسے کسی قدیم عمارت کے کھنڈر ہوں۔ اونٹ ان میں گھومتے اور موڑ مڑتے ہوئے ایک جگہ رُک گئے جہاں دو لالٹینیں روشن تھیں اور بہت سارے آدمی گپ شپ لگا رہے تھے۔ میرے تعارف کے بعد ایک آدمی نے میرے ہاتھوں پر قرآن رکھا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اور یہ حلف لیا ــــ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ اپنے وطن الجزائر کی آزادی کی خاطر کسی قربانی سے مُنہ نہیں موڑوں گا، خواہ یہ قربانی میری جان کی ہو.... اور میں قرآنِ مقدّس کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی راز فاش نہیں کروں گا۔ قید کی صورت میں ہر اذیّت اور تشدّد برداشت کروں گا۔ اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہیں کروں گا۔"

اس حلف نے مجھے عمر سے زیادہ جوان کر دیا اور ایسے لگا جیسے میں وہ نہیں ہوں جو ایک افسر کا بیٹا تھا اور جس نے فرانسیسی سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ دو تین روز بعد مجھے دشمن کے ٹرکوں پر حملے کرنے کی ٹریننگ اس طرح دی جانے لگی جس طرح شیرنی اپنے بچّوں کو شکار کی ٹریننگ دیا کرتی ہے۔ فرانسیسیوں نے بیستان میں کہیں کہیں چوکیاں بنا رکھی ہیں جو مٹی کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے قلعے ہیں۔ ہم ان پر فائرنگ کیا کرتے ہیں۔ انہیں راشن وغیرہ پہنچانے کے لیے ٹرک جایا کرتے ہیں۔ ہم ان ٹرکوں کو روکنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

میں کئی شبخون مار چکا ہوں۔ تین بار بھکاریوں کے بھیس میں ماں سے مل آیا ہوں۔ شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہمارے گھر ہیں۔ وہاں ہمارے عزیز رشتہ دار رہتے ہیں مگر ہم میں سے جو مارے جاتے ہیں انہیں ہم بیستان میں دفن کر دیتے ہیں۔ اُن کی لاشیں ہم اُن کے گھروں تک نہیں پہنچا سکتے۔

میں نے کئی معرکے لڑے ہیں۔ ایک روز مخبروں نے آ کر بتایا کہ کچھ قیدی ایک جیل خانے سے کسی دوسری جگہ لے جائے جا رہے ہیں۔ تین گاڑیاں بتائی گئی تھیں۔ ان کی روانگی کا وقت شام سے پہلے کا تھا۔ لیڈر نے ان گاڑیوں پر حملہ کرنے کے لیے مجھے بھی منتخب کیا۔ پتہ چلا کہ میرا باپ بھی اس پارٹی کے ساتھ جا رہا ہے اور اسی نے مجھے منتخب کرایا تھا۔ ہم کل پندرہ آدمی تھے۔

جس سڑک پر گاڑیاں آ رہی تھیں، وہ ایک ایسی جگہ سے گزرتی ہے جہاں دونوں طرف ریتلی چٹانیں ہیں۔ اس علاقے کے ساتھ ہی دو گاؤں ہیں۔

ہم وقت پر وہاں پہنچ گئے اور لیڈر نے ہمیں گھات میں بٹھا دیا۔ گھات

کے لیے علاقہ نہایت اچھا تھا۔ ٹیلوں کی اوٹ بہت اچھی تھی۔ درخت ایک بھی نہیں تھا۔ مجھے باپ نے ایسی جگہ پوزیشن میں بٹھایا جو سڑک کے قریب تھی۔ میرا کام یہ تھا کہ مجھے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو گولی مارنی تھی اور اگر گولی خطا جائے تو گاڑی کے ٹائروں پر فائر کرنا تھا۔ میرے پاس رائفل تھی۔ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ہدایات دے دی گئی تھیں۔

صحرا کی یہ سڑک ٹیلوں کے اُوپر سے دُور تک نظر آتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہمیں دُور کی گونج سُنائی دی جو تیزی سے بڑھی آئی اور یہ ہوائی جہاز کی آواز بن گئی۔ دُوسری جنگِ عظیم کے وقت کا ایک لڑاکا بمبار ہوائی جہاز بڑی کم بلندی پر آ رہا تھا۔ ہمیں اپنے لیڈر کی للکار سُنائی دی ــــ "چھپ جاؤ۔"

ہم سب جہاں تھے وہیں چھپ گئے۔ ہوائی جہاز اتنی کم بلندی سے ہمارے اُوپر سے گذرا کہ ہم اسے رائفلوں کی گولیوں سے گرا سکتے تھے۔ وہ آگے جا کر واپس آ گیا اور ہمارے اُوپر دو تین چکّر کاٹ کر جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ یہ ہمارے لیے خطرہ تھا۔ یہ قیدیوں کی گاڑیوں کی حفاظت کے لیے آیا تھا۔ ہماری حرکت پر یہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ مجاہدین نے فوجی کنوائیوں پر اتنے زیادہ حملے شروع کر دیئے تھے کہ اب فرانسیسی حکومت نے کنوائیوں کی حفاظت کے لیے ہوائی جہاز استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے۔

ہمارے پاس طیارہ شکن گنیں نہیں تھیں۔ ہوائی جہازوں کے مقابلے میں ہم نہتے تھے لیکن ہمیں بے تیغ لڑنا تھا۔ ہمارے لیڈر ہمیں کہا کرتے ہیں کہ مسلمان جذبۂ ایمانی سے لڑا کرتا ہے اور یہ کفر اور اسلام کی لڑائی ہے۔

میں جس جگہ تھا وہاں سے مجھے تقریباً ایک میل دُور تک سڑک نظر آتی تھی۔ میں اُدھر دیکھ رہا تھا کہ مجھے قیدیوں کے قافلے کی پہلی گاڑی نظر آئی۔ ٹیلوں یعنی ہماری گھات میں سے مجھے اپنے باپ کی للکار سُنائی دی۔ وہ اوپر تھا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا ــــ "خبردار.... گاڑیاں زیادہ ہیں۔"

گاڑیاں زیادہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ گارد کی نفری زیادہ ہے۔ قیدیوں کی گاڑیوں کو ہم سب پہچانتے ہیں۔ یہ پنجرے سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ان پر فائر کرتے ہمیں احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کوئی قیدی نہ مارا جائے۔

الجزائر میں اخلاقی قیدیوں کی بہت کمی ہے۔ سب "بغاوت کے جرم" میں پکڑے ہوئے ہیں۔ مسلمان اب کوئی جرم نہیں کرتے۔ جیل خانوں میں جو اخلاقی قیدی ہیں وہ یورپی باشندے ہوں گے۔ یہ قیدی جو ہمارے سامنے سے گذرنے والے تھے، مجاہدین تھے جن میں بعض گھروں سے پکڑے گئے تھے اور بعض مختلف معرکوں اور چھاپوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ ہم انہیں رہا کرانے آئے تھے۔

اپنے لیڈر کی للکار سنائی دی — "خبردار..... اوپر ہوائی جہاز ہے"۔

اب ہوائی جہاز تھا نہیں، گاڑیاں کم و بیش ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہمارے قریب آ گئی تھیں۔ پہلے ہوائی جہاز ہمارے اوپر سے گذر گیا۔ میں نے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو شست میں لینا شروع کر دیا۔ گاڑی جب ایک سو گز تک آ گئی تو میں نے ٹریگر دبا دیا۔ مجھے گاڑی کی سکرین ٹوٹتی نظر آئی۔ گاڑی سیدھی گذر گئی۔ میں نے دونوں ٹائروں پر بڑی تیزی سے دو گولیاں فائر کیں۔ اس کے ساتھ ہی میری باقی پارٹی نے فائرنگ شروع کر دی۔

اگلی گاڑی اچانک دائیں کو گھومی اور الٹ گئی۔ میرا خیال ہے میری گولی ڈرائیور کو لگی تھی۔ اس گاڑی نے سڑک بند کر دی۔ قیدیوں کی گاڑیاں صرف دو تھیں۔ باقی چار گاڑیاں گارد کی تھیں۔ گارد کی نفری اسّی نوّے تھی۔ اس کے پاس مشین گنیں تھیں۔ ہم صرف پندرہ تھے۔ اگلی گاڑی گارد کی تھی۔ یہ پولیس کی گارد تھی۔ وہ تو بیکار ہو چکی تھی کیونکہ گاڑی الٹ گئی تھی۔ اوپر سے ہماری مشین گنوں کے فائر نے اس میں سے ایک بھی آدمی کو نہ اٹھنے دیا۔

دوسری گاڑیوں کی گارد نے مقابلہ شروع کر دیا۔ پوزیشن تو ہماری اچھی تھی مگر اوپر سے ہوائی جہاز آ گیا۔ گارد کے پاس شاید وائرلیس سیٹ تھا۔ اس سے ہوائی جہاز کے پائلٹ کو اطلاع دی گئی ہوگی۔ ہوائی جہاز غوطے میں آیا اور اس کی مشین گنوں نے گولیوں کا مینہ برسا دیا۔ ہماری توجہ نیچے

پولیس گارد پر تھی۔ اس کا بہت نقصان ہو چکا تھا مگر ہوائی جہاز کی بار بار فائرنگ سے ہماری پوزیشن کمزور ہو گئی۔ ہوائی جہاز آتا تھا تو ہم دبک جاتے تھے۔ اس دوران پولیس کی نفری اچھی پوزیشن میں ہو جاتی تھی۔ بہت سے سپاہی ٹیلوں کے اندر آ گئے۔

میں نے اپنی پوزیشن بدل لی اور کچھ اوپر چلا گیا۔ دو ٹیلوں کے درمیان مجھے دو فرانسیسی نظر آئے۔ میں انہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ سارجنٹ تھا اور وہ مارکونی کا خاوند تھا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ وہ ٹیلے کے ساتھ لگا نہایت آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے رائفل کی شست میں لے لیا۔

"میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی"۔ مجھے مارکونی کی آواز سنائی دی — "تم حق پر ہو۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی"۔

میری انگلی رائفل کے ٹریگر سے ہٹ گئی۔ مارکونی نے مجھے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ اگر وہ مجھے اس رات خبردار نہ کر دیتی کہ میرے گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑے گا تو میرا باپ پکڑا جاتا اور میرے گھر سے ایک پستول اور دو خنجر برآمد ہوتے اور میں بھی باپ کے ساتھ جیل خانے میں اذیتیں سہہ رہا ہوتا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں مارکونی کو بیوہ کر دوں یا اس کے احسان کا صلہ دوں۔ مجھے اچانک اپنی قوم کی بیوائیں یاد آ گئیں جن کے خاوندوں کو فرانسیسیوں نے شہید اور قید کیا تھا۔ الجزائر کی ہر بیوی بیوہ ہونے کی منتظر رہتی تھی۔

میری انگلی ٹریگر پر چلی گئی اور میں نے اللہ سے بخشش مانگ کر انگلی دبا دی۔ مارکونی کا خاوند سیدھا ہو گیا پھر ایک پہلو پر گرا۔ میں نے دوسری گولی چلائی اور سارجنٹ کا ساتھی بھی ڈھیر ہو گیا۔

ہم قیدیوں کو آزاد نہ کرا سکے۔ ان کی گاڑیاں نکل گئی تھیں۔ ہوائی جہاز چلا گیا تھا مگر پھر آ گیا۔ شاید یہ دوسرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شام کی تاریکی نے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمیں چھپالیا۔ ہوائی جہاز چلا گیا۔ میرے پندرہ ساتھیوں میں سے آٹھ شہ
ہو چکے تھے۔ میرا باپ زخمی تھا۔ رات کو ہم لاشیں اٹھائے اپنے ٹھکانے
پر پہنچ گئے۔ پولیس کا کچھ اسلحہ ہمارے ہاتھ لگا۔

سات آٹھ روز بعد میں بھکاریوں کے بھیس میں اپنی ماں کو دیکھنے
گیا۔ اُس نے بتایا کہ مارکونی کا خاوند مارا گیا ہے اور وہ بہت غمگین ہے
میں نے ماں کو نہ بتایا کہ مارکونی میرے ہاتھوں بیوہ ہوئی ہے۔ ماں سے
میں نے کہا کہ وہ کسی بہانے مارکونی کو یہاں لے آئے۔

معلوم نہیں کس بہانے ماں مارکونی کو اپنے ساتھ لے آئی۔ میں اُسے
الگ کمرے میں لے گیا۔ وہ بہت غمگین تھی۔ اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں
"مارکونی!" — میں نے اُسے کہا — "میں نے اپنا قومی فرض ادا کر
ہے جس سے تم بیوہ ہوگئی ہو۔ تمہارا سہاگ میری گولی کا نشانہ بنا ہے۔ تمہارا خاوند
میرے سامنے آگیا تھا.... میں قوم کا فرض پُورا کر چکا ہوں۔ اب میں ذاتی فرض
ادا کرنا چاہتا ہوں"... میں نے اپنے کپڑوں کے اندر چھُپایا ہُوا پستول نکالا۔
پستول مارکونی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "یہ لو، اور اپنے خاوند کے
خون کا بدلہ لے لو۔ میں نے تمہیں اسی لیے بُلایا ہے۔ میں تمہارے احسان کا صلہ
نہیں دے سکا۔ اپنی جان دے سکتا ہوں۔ یہ لو پستول، میری جان لے
لو۔ ایک بات کہوں گا۔ میری ماں سے انتقام نہ لینا۔"

اُس نے پستول میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے دیکھا، پھر مجھے دیکھا
اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے پستول مجھے دے دیا۔

"چلے جاؤ شمس! یہاں سے چلے جاؤ" — اُس نے روتے ہوئے
کہا۔ اُسے اچانک غصّہ آگیا۔ دانت پیس کر بولی — "اپنی ماں کو یہاں سے
لے جاؤ۔ اُسے کہیں غائب کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اُسی سے انتقام لے
لوں۔ اُسے لے جاؤ، ورنہ میری رپورٹ پر پکڑی جائے گی۔"

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اب میری ماں ایسی جگہ ہے جہاں اُسے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ وہ

ماں جو شہزادی تھی، افسر کی بیوی جسے گھر میں امیرانہ آسائشیں حاصل تھیں،
اب چھوٹے سے ایک صحرائی گاؤں میں دو بکریاں پال رہی ہے۔ روکھی سوکھی
کھاتی ہے۔ میں اور کبھی میرا باپ اُسے دیکھنے جاتے ہیں تو وہ مُسکراتی ہوئی
ملتی ہے، اور کہا کرتی ہے — "الجزائر آزاد ہو کے رہے گا۔ ریگستان کی ریت
شہیدوں کے خُون سے تر ہو چکی ہے۔ آزادی کی کونپل پھُوٹے گی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تیسرا آدمی

الجزائر کی جنگِ آزادی کی کہانی مسلمانوں کے جذبۂ حریّت اور جذبۂ ایثار کی ایسی مثال ہے جو صرف مسلمان ہی پیش کر سکتے ہیں۔ الجزائر کے اسلام کے شیدائیوں نے جس طرح اپنے وطن کو فرانسیسی استبداد سے آزاد کرایا ہے وہ اس لحاظ سے دوسری قوموں کے لیے حیران کن ہے کہ حریّت پسند فوج کی صورت میں منظّم نہیں تھے اور ان کے پاس فرانسیسی فوج جیسے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ ان کے لڑنے کے طریقے کو "دہشت پسندی" کہا جاتا ہے۔ صحیح الفاظ میں یہ گوریلا جنگ تھی۔ یہ کہانی اسی جہادِ آزادی کا ایک سچّا واقعہ ہے۔

محمود بن مُصطفےٰ حریّت پسندوں کے ایک سیکٹر کا کمانڈر تھا لیکن فرانسیسی پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ حکومت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ وہ دن کے وقت ایک امن پسند شہری کی طرح گھومتا پھرتا، گپ شپ لگاتا یا اپنے دفتر میں کام کرتا نظر آتا تھا۔ صرف اُس کے گروہ کو معلوم تھا کہ وہ آٹھ فرانسیسی افسروں کو دستی بموں سے اُڑا چکا ہے اور تین چار فوجی کنوائیوں پر بھی وہ حملے کر چکا ہے۔ محمود بہت دلیر حریّت پسند تھا۔ اسی لیے اُسے ایک سیکٹر کا خفیہ کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ قتل کے فن کا ماہر ہے۔ اسے ماہر قاتل فرانسیسیوں نے بنایا تھا جو اس کے ملک پر قابض تھے اور ہزاروں حریّت پسندوں کو قتل کر چکے تھے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کچھ دنوں سے ایک الجزائری عیسائی جس کا نام مچل تھا، اُسے کہہ رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کرلے کیونکہ وہ بھی فرانسیسی حکومت کے سخت خلاف تھا۔ وہ اپنے وطن کو مذہب پر ترجیح دے رہا تھا۔ محمود اُسے ٹال رہا تھا کیونکہ مچل عیسائی تھا۔ محمود اُس کے سامنے اعتراف کر ہی نہیں رہا تھا کہ اُس کا وطن کی آزادی کے ساتھ کوئی تعلق ہے مگر مچل کو یقین تھا کہ محمود جھوٹ بول رہا ہے۔

مچل تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اُس نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس کی ماں فرانسیسی تھی اور باپ الجزائری عیسائی۔ مچل کی ماں کٹر فرانسیسی تھی۔ اُس نے اپنے خیالات کو اپنے خاوند اور بیٹے پر غالب کر رکھا تھا۔ مچل کا باپ سرکاری ملازم تھا اور سرکار فرانسیسی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ الجزائر کے گنوار مسلمانوں کو آزادی ملنی چاہیئے۔ وہ اپنے آپ کو فرانسیسی حکومت کا نہایت اہم کل پُرزہ سمجھا کرتا تھا۔

مچل کا جب شعور بیدار ہُوا تو اُس نے مسلمانوں کو اپنے گھر میں ملازم دیکھا تھا اور ماں نے اُسے بتایا تھا کہ ان مسلمانوں کا حق صرف اتنا ہے کہ انہیں برائے نام تنخواہ اور دو وقت روٹی کے عوض گھر میں نوکر رکھ لیا جائے۔ مچل جب جوان ہُوا تو اُس کے اندر ایک چنگاری سُلگنے لگی۔ اس کے بعد یہ احساس بیدار ہوگیا کہ وہ الجزائری ہے اور فرانسیسیوں کا غلام۔ اس احساس کی بیداری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ مسلمان لڑکوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اپنی ماں اور اپنے باپ سے پُوچھے کہ سمندر پار سے کوئی قوم آکر دوسری قوم کو کیوں محکوم بنا لیتی ہے اور انسان کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو برائے نام تنخواہ اور دو وقت روٹی کے عوض ملازم رکھ لے مگر وہ اپنی ماں سے ڈرتا تھا۔ اُسے پوچھنے کی جرأت نہ ہُوئی۔

ایک روز ایک مسلمان نوجوان نے اُسے کہا "تمہارا باپ غدار ہے جو الجزائری ہو کر فرانسیسیوں کا وفادار بنا ہُوا ہے۔"

دوسرے نوجوان نے اُسے کہا "تمہارا باپ فرانس کا نہیں تمہاری ماں کا غلام ہے۔"

اور جب مچل کی عمر اٹھائیس سال ہوئی تو الجزائری مسلمان گوریلا طرز کی جنگِ آزادی شروع کر چکے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے مسلمان دوست اب سینہ تان کر بات کرتے تھے۔ مچل پر ان باتوں نے اور دوستوں کے طعنوں نے ایسا اثر کیا کہ وہ مسلمان حریّت پسندوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا۔

ایک روز اُسے دو مسلمان دوستوں نے اُسے کہا "تمہارا باپ بھی حریّت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوگا۔"

مچل کو اپنے باپ سے محبّت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا باپ قتل ہو جائے اور قتل بھی ایسا بھیانک کہ گرینیڈ سے اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر جائیں۔ ایک شام اُس نے باپ کے ساتھ بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن باپ نے پہلے فرانسیسی حکومت کی مدح سرائی شروع کر دی پھر وہ الجزائری مسلمانوں کو کوسنے لگا۔ مچل اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر اُس نے اپنی اس کمزوری کو بھانپ لیا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر وہ اپنی اس قوت کے آگے بھی بے بس تھا کہ اُس میں جذبۂ آزادی پیدا ہوگیا تھا اور اُس نے مذہب کو ایک طرف رکھ کر وطن کو آزاد کرانے کا تہیّہ کر لیا تھا۔

اُسے ایک بار اپنے ہم مذہب دوستوں نے کہا تھا کہ یہ مسلمانوں کی جنگ ہے اِس لیے مچل اس سے کنارہ کش رہے۔ مچل نے ایک ہی بار انہیں جواب دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔

"وطن آزاد ہو تو انسان کا کوئی مذہب ہوتا ہے"۔ اُس نے جواب دیا تھا۔ "وطن غلام ہے تو انسان مسلمان ہے نہ عیسائی۔ وطن اپنے باشندوں کو مذہبوں میں تقسیم نہیں کیا کرتا۔ میں جب تک فرانسیسیوں کا غلام ہُوں، میں بے مذہب ہوں۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یہی بے چینی تھی جو اُسے محمود بن مُصطفےٰ کے پاس لے گئی تھی مگر محمود اُسے جاسوس سمجھ رہا تھا۔ یہ مچل کی بے تابیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر محمود کو ماننا پڑا کہ مچل جاسوس نہیں لیکن مچل کو آزمانے کے لیے محمود نے اُسے بڑا ہی خطرناک مشن دیا۔ مشن یہ تھا کہ ایک فرانسیسی افسر کی کار میں گرینیڈ پھینکنا تھا۔ ایسے واقعات تو الجزائر میں ہوتے ہی رہتے تھے۔ فرانسیسی افسر حریت پسندوں کے ہاتھوں مرتے ہی رہتے تھے۔ بعض حریت پسند صاف بچ کر نکل جاتے اور جو پکڑے جاتے انہیں ڈیتول کے جہنم میں پھینک دیا جاتا تھا۔

محمود نے اس فرانسیسی افسر کو قتل کرنے کا جو طریقہ اور موقع بتایا تھا، اس سے مچل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سوچ یہ تھی کہ یہ فرانسیسی افسر مچل کے باپ کا گہرا دوست تھا۔ وہ اسی افسر کے دفتر میں افسر تھا۔ منگل کی صبح کو وہ دونوں تالاب میں تیراکی کے لیے جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ مچل کا باپ اپنے گھر سے تالاب پر چلا جاتا اور فرانسیسی افسر اپنے گھر سے پہنچ جاتا تھا۔ اُس کی کار تھی۔ کبھی کبھی وہ مچل کے باپ کو کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ جایا کرتا تھا۔ مچل کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اُس کا باپ بھی اُس کے ہاتھوں مارا جائے۔ مچل کو اپنے باپ کے ساتھ اتنی زیادہ محبت تھی کہ سیاسی اختلافات کے باوجود یہ اُس کی برداشت سے باہر تھا کہ اُس کا باپ قتل ہو جائے۔

محمود اس فرانسیسی افسر کو ہر روز دیکھتا۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک اُس کا پیچھا کرتا تھا۔ وہ پُورا ایک مہینہ اس افسر کے معمول کا جائزہ لیتا رہا۔ اُسے وہ ایسی جگہ قتل کرنا چاہتا تھا جہاں اُسے پکڑنے والا کوئی نہ ہو اور اُس کا وار خالی بھی نہ جائے۔ اُس نے آخر منگل کی صبح کو نہایت موزوں وقت قرار دیا۔ اتنی سویرے سڑکوں پر بہت کم لوگ ہوتے تھے اور جس تالاب پر وہ افسر جایا کرتا تھا وہ گنجان آبادی سے الگ تھلگ تھا۔ وہاں یا راستے میں اُس کی کار کے اندر دستی بم کسی کو نظر

آئے بغیر پھینکا جا سکتا تھا۔

یہ کام محمود کو خود کرنا تھا۔ اُس نے ایک گرینیڈ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اتنے میں مچل اس کے پیچھے پڑ گیا کہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کر لے۔ محمود نے اُسے آزمانے کے لیے یہی مشن دے دیا اور اُسے بتایا کہ وہ منگل کی صبح فلاں جگہ اس افسر کی کار میں گرینیڈ پھینکے۔ محمود نے اُسے بتایا تھا کہ گرینیڈ سے جب پن نکال لو تو اسے مٹھی میں دبا کر رکھنا ورنہ یہ ہاتھ میں ہی پھٹ کر جسم کے پرخچے اُڑا دے گا۔

منگل کی صبح مچل اُس جگہ کے قریب جہاں اُسے کار کے اندر گرینیڈ پھینکنا تھا ایک قہوہ خانے میں بیٹھا کار کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے کوٹ کی جیب میں گرینیڈ تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اس جیب میں ڈال رکھا تھا اور اس ہاتھ کی انگلیاں گرینیڈ کے پن کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ اپنے باپ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ نیشنل لبریشن فرنٹ میں شامل ہو چکا ہے۔ اُسے افسوس سا ہو رہا تھا کہ وہ باپ کو دھوکہ دے رہا ہے لیکن اُسے یہ امید حوصلہ دے رہی تھی کہ الجزائر کے نوجوان مجاہدین جان اور خون کی قربانیاں دے کر وطنِ عزیز کو آزاد کرا لیں گے تب مچل کے باپ کو پتہ چلے گا کہ اُس کا بیٹا بھی آزادی کی جنگ لڑنے والوں میں سے تھا تو وہ فخر کرے گا۔ اُس وقت وہ محسوس کرے گا کہ جنہیں وہ اور اس کے فرانسیسی آقا دہشت پسند، قاتل اور ڈاکہ زن کہتے رہے ہیں وہ دراصل آزادی کے علمبردار تھے۔

مچل کا سینہ فخر سے پھیل گیا مگر اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ کبھی کسی کا خون نہیں بہایا تھا۔ اب وہ ایک آدمی کے جسم کے ٹکڑے اُڑا دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے آزادی کی تنظیم کوئی اور کام دے دیتی۔ دیواروں پر پوسٹر لگانے جیسا کام زیادہ خطرناک نہیں تھا لیکن محمود نے اُسے پہلا ہی مشن ایک

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آدمی کے قتل کا دُکھ تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُسے اپنے باپ کا بھی خیال آیا جس کے متعلق اُسے ڈر تھا کہ اس فرانسیسی کی کار میں نہ ہو۔

وہ اتنا ڈرا کہ اُس نے تقریباً فیصلہ کر لیا کہ محمود سے جا کر کہہ دے کہ وہ جنگِ آزادی کی ابتدا کسی آسان مشن سے کرے گا مگر اُسے ایک اور بات یاد آ گئی۔ محمود نے اُسے قبرستان میں لے جا کر چھ سات قبریں دکھائی تھیں اور اُسے کہا تھا کہ ان قبروں میں وہ آدمی دفن ہیں جو ڈر کے مارے یا کسی لالچ میں آ کر اپنا مشن پُورا نہ کر سکے۔ انہیں محاذِ آزادی نے گولی مار دی تھی۔ محمود نے مچل سے کہا تھا کہ اگر اُس نے محاذ کو دھوکہ دیا یا ڈر کی وجہ سے مشن پُورا نہ کیا تو اُسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔

یہ سوچ کر اُس نے اپنے آپ کو مجبور پایا۔ اتنے میں نیلے رنگ کی ایک کار آتی نظر آئی۔ مچل پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُسے سڑک کے کنارے جا کھڑا ہونا تھا۔ وہاں سے سڑک نوّے درجے کے زاویے پر مڑتی تھی۔ کار کو آہستہ ہونا تھا۔ مچل کو اس کے قریب سے گزرنا اور گرینیڈ کار کے اندر پھینکنا تھا مگر اُس کا شکار موڑ پر رُک گیا کیونکہ آگے آگے اونٹوں کا قافلہ جا رہا تھا جس کے دو تین اونٹ سڑک کے درمیان آ گئے تھے۔

مچل صرف یہ دیکھ سکا کہ کار میں تین آدمی ہیں۔ اُس نے سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے ایک الجزائری مسلمان کو بھی پہچان لیا۔ اُس کا نام منصور الخیری تھا۔ وہ بھی افسر تھا اور غدّار تھا۔ اُس نے اپنے دو ماتحتوں کو گرفتار کروا دیا تھا کہ وہ نیشنل لبریشن فرنٹ کے درپردہ رکن تھے۔ مچل کو خوشی ہوئی کہ وہ ایک تیر سے دو شکار مارے گا مگر کار کی پچھلی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا جسے وہ نہ پہچان سکا کیونکہ دروازے کا شیشہ اُوپر تھا اور اس پر صبح کی دُھوپ پڑ رہی تھی۔ اگلے دروازے کا شیشہ اُترا ہُوا تھا۔

مچل رُکی ہوئی کار کے قریب سے گزرا جیسے صرف گزر رہا ہو اور کار کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُس نے دُوسرا ہاتھ بھی گرینیڈ والی

جیب میں ڈال کر گرینیڈ کا پن نکال لیا اور گرینیڈ کو مٹھی میں پکڑ لیا۔ وہ کار کے ساتھ لگ کر گزرا اور اُس نے گرینیڈ کار کے اگلے دروازے کے اندر پھینک دیا۔ وہ ابھی کار کے قریب ہی تھا کہ دل دہلا دینے والا دھماکا ہُوا۔ کار شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی اور جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی۔ مچل خود بھی زخمی ہو گیا۔ وہ وہیں رُک کر چلّانے لگا جیسے کوئی راہرو بے گناہ زخمی ہو گیا ہو۔

کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اونٹ بدک کر سڑک پر پھیل گئے۔ کچھ لوگ جلتی کار کا تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے اور مچل ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ بعض نے اس کے ساتھ ہمدردی کی کہ وہ راہ جاتے زخمی ہو گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا کہ اُس کا پہلا ہی مشن اس قدر کامیاب تھا کہ جنہیں مارنا مقصود تھا وہ اُس کے ہاتھ سے مارے گئے اور اُس پر کسی کو شک بھی نہ ہُوا۔

وہ محمود کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنا مشن پُورا کر آیا ہے اور فرانسیسی افسر کے ساتھ وہ غدّار منصور الخیری کو بھی مار آیا ہے۔

"مگر میں پہچان نہ سکا کہ کار میں تیسرا آدمی کون تھا" — مچل نے کہا۔

"وہ بھی کوئی غدّار ہی ہو گا" — محمود نے کہا — "جہاں مجاہدین مارے جا رہے ہیں وہاں کوئی اور مارا گیا تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔"

محمود نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی۔ مچل سینہ تانے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ وہ ماں سے بچتا بچاتا غسل خانے میں چلا گیا۔ اُس نے غسل کیا اور خُون آلود کپڑے لپیٹ کر چھپا دیے تاکہ ماں نہ دیکھ لے۔ وہ غسلخانے سے نکلا تو اُس کی ماں سامنے آ گئی۔ مچل نے اُس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا کہ وہ دفتر چلا گیا ہے یا تیار ہو رہا ہے۔

"وہ تالاب پر چلے گئے ہیں" — اُسے ماں نے بتایا — "وہ فرانسیسی افسر آ گیا تھا۔ اُس کے ساتھ منصور الخیری بھی تھا۔ وہ تمہارے باپ کو کار میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بچل کا دل ڈوب گیا۔ کار میں تیسرا آدمی اُس کا باپ تھا۔ اُس کے ہاتھوں اُس کا باپ بھی مارا گیا تھا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ باہر نکل گیا اور محمود کے ہاں چلا گیا۔

"کیا اب بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے؟" اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "میں نے اپنے باپ کو بھی قتل کر دیا ہے۔ میں اپنے باپ کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا ہُوا" محمود نے کہا۔ "اچھا ہُوا کہ تمہارا باپ بھی مارا گیا ہے۔ غدار اگر باپ ہو تو بھی اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

انگریز، انسان اور گدھا

گدھا گدھا ہی ہوتا ہے۔ اسے سجا سنوار کے رکھو، اس کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کرو، وہ گدھا ہی رہتا ہے مگر کسی انسان کو جب گدھا سمجھ لیا جائے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوتا ہے۔ کہانی جو میں آپ کو سنانے لگا ہُوں، یہ دو انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں نے انگریز دیکھے ہوں گے مگر انہیں برصغیر کے بادشاہوں کے روپ میں نہیں دیکھا۔ وہ ہم نے دیکھا ہے جو اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ انگریز کالی چمڑی والے سے نفرت کرتے اور ہمیں گدھا سمجھا کرتے تھے۔ انگریزوں نے جس ملک پر بھی حکومت کی، وہاں کے انسانوں کو انہوں نے گدھا سمجھا۔ اور ایک ہمارا میجر ڈگلس کرَ تھا جو لیبیا کے ایک بدو کو گدھا سمجھ بیٹھا۔ اگر میجر ڈگلس کرَ ابھی تک زندہ ہے تو وہ اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے ضرور کہتا ہو گا کہ کسی انسان کو گدھا نہ سمجھنا۔

یہ واقعہ دوسری جنگِ عظیم کا ہے۔ میں سگنل کور میں میجر ہُوا کرتا تھا۔ میں آپ کو جنگ کے واقعات نہیں سناؤں گا۔ اُن حضرات کو جنہیں جنگ کا زمانہ یاد ہے، یاد دلاؤں گا کہ جرمنی کی فوج شمالی افریقہ میں لیبیا میں آ گئی تھی۔ آپ کو جرمن جنرل رومیل کا نام یاد ہو گا جس نے شمالی افریقہ پر حملہ کر کے انگریزوں کی فوج کو بُری طرح پسپا کیا تھا۔ پسپا ہونے والوں میں انگریزوں کی ہندوستانی فوج بھی تھی۔ پھر یُوں ہُوا کہ انگریزوں نے امریکی فوج اور ایئر فورس کی مدد سے جوابی حملہ کیا۔ اُدھر رومیل کو اپنے ہی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ڈکٹیٹر ہٹلر نے دھوکہ دیا۔ جرمن فوج پسپا ہوگئی اور اُسے افریقہ سے نکلنا پڑا۔ بن غازی اور العالمین کے ریگستان میں تاریخ کی سب سے بڑی ٹینکوں کی جنگ لڑی گئی تھی۔

جرمنی کی پسپائی کے بعد اس صحرا کی حالت بڑی ہی خوفناک اور عبرتناک تھی۔ گاؤں اُجڑ گئے تھے۔ وہاں گدھوں، گیدڑوں اور لومڑیوں کی حکمرانی تھی۔ لاشیں ہر طرف بکھری ہوتی تھیں۔ جلے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ٹینکوں اور دیگر فوجی گاڑیوں میں بھی یہ مُردار خور پرندے اور درندے نظر آتے تھے۔ انسانوں کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں تو ہر جگہ دکھائی دیتی تھیں۔

میں اُس وقت بن غازی سے تیس بتیس میل دُور ایک فوجی پوسٹ میں تھا جو کچی دیواروں کا قلعہ سا تھا۔ اس میں سگنلز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ انٹیلی جنس کا انگریز عملہ بھی تھا۔ اس علاقے میں اب جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اتحادی (انگریز اور امریکی) بحیرۂ روم عبور کر کے اٹلی کو فتح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگ آرام کی زندگی گذار رہے تھے۔

میجر ڈگلس کر کا تعلق برٹش انٹیلی جنس سے تھا۔ وہ اُس علاقے کی زبان جو عربی کی ذرا سی بگڑی ہوئی صورت تھی، بڑی اچھی طرح بولتا اور سمجھتا تھا۔ ہمارے ملازم (بیرے، گائیڈ اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے والے) اُسی علاقے کے رہنے والے لوگ تھے۔ وہ عربی لباس پہنتے اور عربی زبان بولتے تھے۔ ان میں زیادہ تر بدّو تھے۔ وہ ایسے علاقوں کے رہنے والے تھے جہاں تک باہر کی دنیا کے لوگ کم ہی پہنچ سکتے تھے۔

صحرا کے متعلق میں تھوڑی سی وضاحت کر دیتا ہوں۔ جنہوں نے صحرا نہیں دیکھا وہ صحرا کو افق تک پھیلا ہُوا ایک میدان سمجھتے ہیں جس میں ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ اللہ آپ کو صحرا سے بچائے۔ یہ زیادہ تر میدان ہی ہوتا ہے لیکن اس میں گنبد نما ٹیکریاں بھی ہوتی ہیں جن کے

اندر چلے جاؤ تو ان سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ بھول بھلیاں سی ہوتی ہیں۔ صحرا میں ریت اور مٹی کے ٹیلوں کے علاقے بھی ہوتے ہیں۔ عجیب عجیب شکلوں کے ٹیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی شکلیں ڈراؤنی اور ہیبتناک ہوتی ہیں۔ صحراؤں میں نخلستان بھی ہوتے ہیں۔ وہاں پانی ہوتا ہے اور درخت بھی ہوتے ہیں۔ صحرا کے قبائلی جنہیں عام طور پر بدّو کہا جاتا ہے، ایسے ہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کا پیشہ لُوٹ مار تھا۔

جنگ کے بعد وہاں بدّو ہی رہ گئے تھے۔ وہ فوجی افسروں کے ملازم تھے۔ اُن کا پیشہ تو رہزنی اور چوری چکاری تھا لیکن جہاں ملازمت کرتے وہاں چوری نہیں کرتے تھے۔ ہمیں ذاتی ضروریات کی بعض اشیاء بن غازی سے لانی پڑتی تھیں۔ انگریز افسر شراب لاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کئی ایک چیزیں تھیں۔ اب چونکہ جنگ بحیرۂ روم سے آگے چلی گئی تھی اس لیے ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کوئی ایک افسر جیپ لے کر بن غازی چلا جاتا اور سامان لے آتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک بدّو ملازم ضرور ہوتا تھا۔

ایک صبح میجر ڈگلس کر جیپ لے کر بن غازی کو روانہ ہُوا۔ اس کے ساتھ ایک بدّو عبداللہ گلالہ گیا۔ اس انگریز منیجر کو بعض افسروں نے کچھ چیزیں لانے کے لیے پیسے دیئے تھے۔ کچھ سرکاری سامان بھی لانا تھا۔ اُسے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں کے بعد واپس آجانا چاہیئے تھا۔ وہ صبح سات بجے نکلا تھا مگر بارہ بج گئے، واپس نہ آیا۔ اُس وقت تک تو ہمیں کوئی فکر نہ ہُوا۔ جب اڑھائی بج گئے تو کچھ تشویش ہونے لگی۔ تشویش تو اُس وقت بھی نہ ہوتی، خطرہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ آندھی آئی تھی۔ صحرا کی آندھی مسافروں کے لیے بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ ایک قدم آگے تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی رُک کر بیٹھ جائے تو چند منٹ میں وہ ریت میں دب جاتا ہے۔ اُس پر ریت کی قبر بن جاتی ہے، اس لیے آندھی میں مسافر رُکتے نہیں۔ اگر آندھی کی تندی زیادہ ہو تو مسافر اس کے زور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سے راستے سے ہٹتے ہٹتے بھٹک جاتے ہیں۔

آندھی نو دس بجے کے وقت آئی اور ایک گھنٹہ بعد گزر گئی تھی۔ بن غازی تک کوئی پکی سڑک یا باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ہماری فوجی گاڑیوں نے ایک راستہ بنا رکھا تھا۔ میجر ڈگلس کر پیدل نہیں جیپ پر تھا اور اس کے ساتھ تجربہ کار بدو تھا۔ کوئی ایسا خطرہ تو نہیں تھا، سوائے اس کے کہ جیپ خراب ہو گئی ہو گی۔

چار بج گئے تو افسروں نے کہا کہ اب ایک گاڑی بھیج دینی چاہیئے۔ چنانچہ ایک جیپ میں موٹر مکینک، پٹرول کے دو کین اور کچھ اور ضروری سامان رکھ کر مجھے کہا گیا کہ میں جاؤں۔ میں چلا گیا۔ راستے میں کہیں بھی میجر ڈگلس کر کی جیپ نظر نہ آئی۔ میں بن غازی تک چلا گیا — دو دکانداروں سے مجھے واقفیت تھی۔ اکثر ان سے سامان خریدا جاتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میجر ڈگلس کر نو بجے ان سے سامان خرید کر چلا گیا تھا۔ میں شہر سے نکلا تو فوجی چیک پوسٹ پر رُک گیا۔ وہاں ایک انگریز میجر نے بتایا کہ میجر ڈگلس کر نو بجے کے لگ بھگ شہر سے نکلا، اس کے پاس ذرا سی دیر کے لیے رُکا اور چلا گیا تھا۔ اُس نے کہا کہ آندھی نے اُسے راستے میں گھیر لیا ہو گا۔ کہیں بھٹک نہ گیا ہو۔

"اٹیلی جنس کا افسر ہے" — میں نے کہا — "یہاں کی زبان بھی جانتا ہے۔"

"وہ شاید یہاں کے بدوؤں کو نہیں جانتا" — اس انگریز میجر نے کہا — "اگر وہ آندھی میں بھٹک کر بدوؤں کے علاقے میں چلا گیا تو صورتِ حال خاصی مختلف ہو گی۔"

اس سے مجھے کچھ خطرہ محسوس ہونے لگا۔ میں واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ وہاں گاڑی تیز نہیں چل سکتی تھی کیونکہ کوئی پکا راستہ نہیں تھا۔ ریت تھی۔ ریت کی ٹیکریاں تھیں۔ تیس میل کا فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ میں ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ پتہ چلا کہ میجر ڈگلس کر نہیں

آیا۔ رات کو اُسے تلاش کرنے کے لیے گاڑیوں میں پارٹیاں بھیج دی گئیں۔ ہر گاڑی میں وائرلیس سیٹ تھا۔

آدھی رات کے بعد ایک پارٹی نے اطلاع دی کہ میجر ڈگلس کر مل گیا ہے۔ میں بھی ایک تلاش پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ میجر ڈگلس کر ہسپتال میں ہے۔ وہ بہت بُری حالت میں ملا تھا۔ پیاس اور تھکن سے اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ جیپ پر نہیں تھا۔ جیپ دُور کہیں کھڑی تھی۔ اس کے چاروں ٹائروں سے ہوا نکلی ہوئی تھی۔ جیپ دوسرے دن لائی گئی۔ اس کے ساتھ عبداللہ گلالہ نہیں تھا۔

اگلے روز شام کو اُسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اُس کے ساتھ جو گزری تھی وہ میں اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔ وہ بن غازی سے سامان خرید کر آ گیا تھا۔ آدھے راستے میں تھا کہ آندھی آ گئی۔ میں بتا چکا ہوں کہ صحرائی آندھی کیسی ہوتی ہے۔ جیپ کینوس سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن اگلی سیٹ کے دونوں طرف کھُلی تھی یعنی اس کے دروازے نہیں تھے۔ آندھی دائیں طرف سے آ رہی تھی اس لیے ریت اس طرح اندر آ کر منہ کو لگتی تھی جیسے کھُلے منہ والے نلکے سے بہت تیز پانی آ رہا ہو۔ جیپ کا اگلا حصہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جیپ کو روک لینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ رُکنے کی صورت میں ریت اتنی جمع ہو جاتی کہ جیپ کے پہیے ریت میں دب جاتے اور گاڑی کو وہاں سے نکالنا مشکل ہو جاتا۔ صحرا کی آندھی سے ریت کے ٹیلے ذرہ ذرہ ہو کر غائب ہو جاتے ہیں اور جہاں کچھ رکاوٹ آ جائے وہاں ٹیلے بن جاتے ہیں۔ انہی کو "متحرک ٹیلے" کہا جاتا ہے۔

میجر ڈگلس کر جیسا دانشمند اور ہوشیار افسر ہوش کھو بیٹھا۔ دانستہ یا غیر دانستہ جیپ کا رُخ مڑ گیا۔ نیچے سڑک ہوتی، کوئی نشان ہوتے تو یقین ہوتا کہ جیپ سیدھی جا رہی ہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ آندھی تھی اور نظر کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ چونکہ میجر ڈگلس کر کے منہ پر دائیں طرف سے ریت کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں اس لیے اُس کی جیپ کا رُخ اُس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے ہاتھوں مُڑتا رہا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد آندھی کا زور تھم گیا اور ماحول نظر آنے لگا۔ میجر ڈگلس کرنے جیپ پھر بھی نہ روکی۔ جب فضا بالکل صاف ہوگئی تو اُس نے جیپ روکی۔ اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے وہ علاقہ غیر مانوس نظر آیا۔ اُس نے عبداللہ گلالہ کی طرف دیکھا۔ گلالہ نے اُسے بتایا کہ وہ راستے سے بہت دُور آگیا ہے۔ یہ بدّو صحرا کا بھیدی تھا۔ اُس نے ہر طرف دیکھ کر ایک طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس سمت چلیں تو تین گھنٹوں میں ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں گے۔

میجر ڈگلس کرنے جیپ چلا دی۔ دو اڑھائی میل دُور ٹیلوں کا علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ کو ریت چلنے نہیں دے رہی تھی

میجر ڈگلس کرنے جیپ روک لی۔ اُسے اپنے سامنے ریت میں کچھ چمکتی ہوئی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ان چیزوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ بارُودی سرنگیں تھیں۔ ان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ علاقہ میدانِ جنگ رہا تھا۔ یہاں مورچے بنے تھے۔ پوسٹیں بنی تھیں اور کیمپ بھی لگے تھے ایسی جگہوں کے سامنے کے علاقے میں بارُودی سرنگیں بچھا دی جاتی تھیں

بارُودی سرنگ (مائن) زمین میں دبائی جاتی ہے۔ اس کی ایک پن سی زمین سے باہر ہوتی ہے۔ اس پر ریت یا مٹی ڈال کر چھپا دیا جاتا ہے اس پر پاؤں آجائے تو پن دب جانے سے بارُودی سرنگ پھٹ جاتی اور انسان کو مار ڈالتی ہے۔ جرمنوں کی بارُودی سرنگیں زیادہ خطرناک تھیں۔ ان کی دبائی ہوئی سرنگیں ایک تار سے ایک دوسری سے ملائی ہوئی ہوتی تھیں۔ تار میں پاؤں پھنس جائے تو سرنگیں پھٹ جاتی تھیں۔ میجر ڈگلس کر کے آگے جو سرنگیں آگئی تھیں وہ جرمنوں کی بچھائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ آندھی نے ان سے ریت ہٹا دی تھی اور ایک تار دکھائی دے رہی تھی۔

جب فوجیں پسپا ہوتی ہیں تو وہ بارُودی سرنگیں کچھی ہوئی چھوڑ جاتی ہیں۔ جنگ کے بعد اکثر لوگ ان سے ہلاک اور زخمی ہوتے رہتے ہیں۔

جس علاقے میں سرنگیں بچھائی جاتی ہیں، اسے مائن فیلڈ کہتے ہیں۔ لیبیا کے میدانِ جنگ میں رہنے والے بدّوؤں نے جنگ کے بعد مائن فیلڈ کا سراغ لگانے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کے پاس اونٹوں کے علاوہ گدھے بھی ہوتے تھے۔ وہ حبِ خانہ بدوشوں کی طرح نقلِ مکانی کرتے تو بڑی احتیاط سے چلتے تھے۔ جہاں انہیں شک ہوتا کہ آگے مائن فیلڈ ہے وہاں وہ ایک گدھے کو مار کر آگے کو بھگا دیتے تھے۔ اگر بارُودی سرنگیں ہوں تو گدھے کے پاؤں کے نیچے آکر ایک سرنگ پھٹ جاتی اور اگر یہ تار سے منسلک ہوں تو ساری سرنگیں پھٹ جاتی تھیں۔ گدھے کے جسم کے تو ٹکڑے ہو جاتے تھے مگر بدّوؤں کا پُورا خاندان بچ جاتا تھا۔

میجر ڈگلس کر کو بدّوؤں کا یہ طریقہ معلوم تھا مگر اُس کے پاس گدھا نہیں تھا۔ صرف عبداللہ گلالہ تھا جو بدّو تھا اور اُس کا نوکر۔ گلالہ بھلا مانس انسان تھا۔ کام محنت اور دیانتداری سے کرتا تھا۔ میجر ڈگلس کرنے اُسی سے گدھے کا کام لینے کی سوچ لی۔ اُسے یقین تھا کہ گلالہ چونکہ ملازم ہے اور اپنے قبیلے سے دُور رہتا ہے اس لیے اُسے معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اُسے بارودی سرنگوں کا سراغ لگانے یا انہیں پھاڑنے کے لیے آگے بھیجا جا رہا ہے۔

میجر ڈگلس کرنے گلالہ سے کہا کہ وہ آگے جائے اور کچھ دُور جا کر سمت کا صحیح تعیّن کرے۔ اس انگریز نے ایک بدّو کو اپنی سلامتی کے لیے قربان کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ دونوں طرف ریت کے ٹیلے تھے جن میں سے جیپ نہیں گذر سکتی تھی۔

گلالہ فوراً آگے چلا گیا۔ وہ چند قدم گیا ہوگا کہ میجر ڈگلس کر زمین پر لیٹ گیا کیونکہ اُسے توقع تھی کہ گلالہ کے کسی نہ کسی قدم کے نیچے بارودی سرنگ پھٹے گی اور اُس کا کوئی اُڑتا ہُوا ٹکڑا میجر ڈگلس کر کو لگ سکتا ہے مگر کوئی دھماکہ نہ ہُوا۔ اُس نے دیکھا گلالہ نیچے دیکھتا اور کبھی دائیں، کبھی بائیں ہو کے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض جگہ وہ پاؤں ذرا اونچا اٹھا کر آگے رکھتا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھا۔ اس طرح چلتے وہ ڈیڑھ دو سو گز دُور نکل گیا پھر واپس آنے لگا۔ وہ پہلے کی طرح چلتا واپس آگیا۔

وہ میجر ڈگلس کرَ کی طرف آنے کی بجائے جیپ کی طرف گیا۔ اگلی سیٹ پر میجر ڈگلس کرَ کا ریوالور پڑا تھا۔ میجر نے بیلٹ اتار کر سیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ ریوالور اسی میں تھا اور اس کے پوچ میں ریوالور کی گولیاں پڑی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میجر ڈگلس کرَ اُسے کہتا کہ وہ اُس کے ریوالور کے ساتھ نہ کھیلے، گلالہ ریوالور میں چھ گولیاں ڈال چکا تھا۔ میجر ڈگلس کرَ اٹھا۔ عبداللہ گلالہ نے ریوالور کی نالی اُس کی طرف کر دی۔

"میں انسان ہوں گدھا نہیں ہوں"۔ عبداللہ گلالہ نے کہا۔ "تم نے مجھے آگے بھیجا تھا کہ میں مر کر تمہارے لیے راستہ صاف کر دوں گا یا تم راستہ بدل لو گے۔ میں جہاں سے گزر کر گیا اور واپس آیا ہوں وہاں بے شمار بارُودی سرنگیں ہیں۔ آندھی نے سب کو ننگا کر دیا ہے اس لیے میں دیکھ دیکھ کر چلتا زندہ واپس آگیا ہوں مگر میں اپنی بے عزتی کا انتقام لوں گا۔ تم نے مجھے گدھا سمجھ کر میری جان لینے کی کوشش کی۔ میں جانتا ہوں میرے قبیلے کے لوگ بارُودی سرنگوں کا سراغ لگانے کے لیے گدھے کو آگے بھیجا کرتے ہیں۔"

میجر ڈگلس کرَ نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے افسروں کی طرح حکم دیا کہ وہ ریوالور اُسے دے دے۔

"فرنگی!"۔ عبداللہ گلالہ نے کہا۔ "میں نے تمہارا نمک کھایا ہے اس لیے تمہیں قتل نہیں کروں گا مگر تم پیدل جاؤ گے۔ اگر بھٹک بھٹک کر مر جاؤ تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ چلے جاؤ۔ اگر رُکے رہے تو گولی مار دوں گا.... چلے جاؤ۔"

بدّو کے تیور دیکھ کر میجر ڈگلس کرَ ایک طرف چل پڑا۔ کچھ دُور جا کر وہ رُکا اور گھوم کر عبداللہ گلالہ کی منّت کی کہ وہ اسے جیپ دے دے۔ گلالہ نے ہوا میں ایک راؤنڈ فائر کر کے کہا۔ "پیدل جاؤ۔ مجھے گدھا نہ سمجھو۔"

میجر ڈگلس کرَ چل پڑا۔ دُور جا کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ عبداللہ گلالہ جیپ کے ایک پہیے کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ شاید ٹائر سے ہوا نکال رہا تھا۔ ہم نے جیپ ڈھونڈلی تھی تو اس کے چاروں ٹائروں سے ہوا بالکل نکلی ہوئی تھی۔ گلالہ تمام سامان جو میجر ڈگلس کرَ نے بن غازی سے خریدا تھا اور شراب کی بوتلیں بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر وہ کبھی نظر نہ آیا۔

میجر ڈگلس کرَ مارا مارا پھرتا رہا۔ پیاس نے اُسے ادھ موا کر دیا۔ رات کی خنکی نے اُسے بچا لیا۔ اگر وہ رات کو مل نہ جاتا یا کہیں دُور نکل جاتا تو اگلے روز اُس کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ وہ شاید اس لیے زندہ رہا تھا کہ انگریز افسروں کو بتاتے کہ انسان گدھا نہیں ہوتا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نُور عنایت خان

جنگِ عظیم دوم ۴۵ - ۱۹۳۹ء سے پہلے فرانس کے "ریڈیو پیرس" سے بچّوں کے پروگرام میں ایک بڑی ہی پیاری نسوانی آواز سنائی دیا کرتی تھی جو بچّوں کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ یہ آواز جس خاتون کی تھی اُس نے بچّوں کے لیے کہانیوں کی متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا۔ فرانس میں فرانسیسی فوج کے ساتھ بیلجیم کی فوجیں بھی تھیں۔ جرمنوں کی بکتر بند یلغار اتنی شدید اور تیز تھی کہ تینوں ملکوں کی فوجیں غیر فوجی طریقے سے بھاگ اٹھیں۔ فرانس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔ شہری بھی بھاگے جن میں سے کچھ تو برطانیہ اور فرانس کے درمیانی سمندر میں ڈوب گئے۔ بعض برطانیہ پہنچ گئے اور خاصی آبادی کو جرمن استبداد میں فرانس میں ہی رہنا پڑا۔ جنگِ عظیم شدّت اختیار کر گئی۔ برطانیہ کی آزادی خطرے میں پڑ گئی۔ احوال و کوائف بتاتے تھے کہ ہٹلر (جرمنی کا ڈکٹیٹر) چند دنوں میں برطانیہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو جائے گا۔

توپوں اور طیاروں کی جنگ لڑی جاتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ایک زمین دوز جنگ شروع ہو گئی جو فضا کی غیر مرئی لہروں پر بھی لڑی جاتی تھی۔ یہ جنگ لڑنے والے باوردی فوجی نہیں تھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نہ وہ کسی کو نظر آتے تھے۔ یہ جاسوسوں اور گوریلا افراد کی جنگ تھی جو اُن تمام ملکوں میں لڑی جا رہی تھی جن پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ یہ محاذ جس ملک میں سب سے زیادہ گرم ہُوا وہ فرانس تھا۔ اس ملک کے باشندوں نے ایک خفیہ تحریک چلائی تھی جسے "تحریکِ مزاحمت" کا نام دیا گیا تھا۔ اس تحریک کے افراد جرمنوں کے گولہ بارُود اور رسد کے ذخیروں کو تباہ (سبوتاژ) کرنے کے علاوہ بذریعہ وائرلیس برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو پیغامات اور جرمنوں کے راز دیتے رہتے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جرمنوں کو فرانس میں امن اور سکون سے نہ رہنے دیا جائے۔ وہ جرمن افسروں کو خفیہ طریقوں سے قتل بھی کرتے تھے اور فرانس کے نظام مثلاً ریلوے، ڈاک وغیرہ کی خرابی کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

فرانسیسیوں نے "تحریکِ مزاحمت" کو جرمنوں کی تباہی کا ذریعہ بنا لیا تو برطانیہ نے اس تحریک کی مدد کے لیے پیراشوٹوں کے ذریعے فرانس میں تربیت یافتہ جاسوس، تخریب کار اور کمانڈو اتارنے شروع کر دیے۔ انہوں نے یہاں تک خطرہ مول لیا کہ فرانس کے جنگلوں اور بیابانوں میں رات کے وقت چھوٹے طیارے اتار کر اپنے آدمی فرانس میں داخل کر دیتے تھے۔ انہیں "تحریکِ مزاحمت" کے خفیہ مراکز بتا دیے جاتے تھے۔ اکثر یہ انتظام کیا جاتا کہ خفیہ الفاظ میں بذریعہ وائرلیس "تحریکِ مزاحمت" کو جگہ اور وقت بتا دیا جاتا تھا کہ فلاں وقت فلاں جگہ ایک یا دو آدمی اتارے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہاں اُترنے والوں کا باقاعدہ استقبال ہوتا تھا۔

"تحریکِ مزاحمت" کے کارکنوں کے سروں پر ہر وقت بڑی ہی اذیت ناک موت منڈلاتی رہتی تھی۔ جرمنی کی سیکرٹ سروس انہیں پکڑنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ جرمنی کی یہ سروس غیر معمولی طور پر ذہین، تیز اور سراغرسانی کی ماہر تھی۔ اس کے ساتھ جرمنی کی مشہور

سروس "گیسٹاپو" تھی۔ مکڑی کی طرح اس کے بے شمار باز و اور ٹانگیں تھیں۔ اس کے تنے ہوئے جالے میں سے کسی کا بچ نکلنا عموماً ناممکن ہوتا تھا۔ "گیسٹاپو" کی اذیتیں اس قدر غیر انسانی تھیں جن کی تفصیل سُن کر ہی دل دہل جاتا ہے۔ جو زمین دوز کارکن "گیسٹاپو" کے ہاتھ لگ جاتے اُسے اذیتیں مجبور کر دیتی تھیں کہ اپنے ساتھیوں کو بھی وہ گرفتار کرا دے۔ یہ اذیتیں جسمانی ہوتی تھیں اور نفسیاتی بھی۔ چونکہ فرانس میں "تحریکِ مزاحمت" جڑ پکڑ گئی اور اس کی تباہ کاریاں جرمنوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں اس لیے جرمنوں نے اپنی سیکرٹ سروس اور "گیسٹاپو" کے سراغرسانوں اور درندہ صفت جرمنوں کی ایک فوج فرانس میں پھیلا دی۔ یہاں سے برطانیہ اور جرمنی کی سیکرٹ سروسوں کی ایسی جنگ شروع ہو گئی جو زمین کے نیچے اور فضا کی لہروں پر لڑی گئی۔

اس خاتون کی کہانی سُنانے سے پہلے جس کی آواز جنگِ عظیم سے پہلے ریڈیو پیرس سے سُنائی دیا کرتی تھی، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جان پر کھیل جانے والے اُن افراد کے متعلق کچھ بتا دیا جائے جو برطانیہ سے فرانس بھیجے جاتے تھے۔ ہر ایک فوجی کو اس کام کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لیے غیر معمولی خصوصیات کی ضرورت تھی۔ مثلاً بے خوفی، خود اعتمادی، قوّتِ ارادی اور قوّتِ فیصلہ، ذہانت اور حاضر دماغی۔ جسمانی لحاظ سے اتنی قوّت درکار تھی کہ نیند، بھوک، پیاس اور مشقّت کو اُس سے کہیں زیادہ دن برداشت کر سکے جو ایک اوسط درجہ تندرست انسان کر سکتا ہے۔ ضدی بچے کی طرح استقلال ہو۔ صبر و تحمل اور فرض کے ساتھ چپکے رہنے کی صلاحیت ہٹ دھرمی کی حد سے زیادہ ہو۔ پکڑے جانے کی صورت میں اذیتیں برداشت کر سکے اور اتنی ہمت رکھتا ہو کہ اس کا جسم کٹتا رہے وہ اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہ کرے اور جرمنوں کو کوئی راز نہ دے تصور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیا جا سکتا ہے کہ اتنی صلاحیتیں دس ہزار میں سے کسی ایک انسان میں ہی ہو سکتی ہیں۔ وہ افراد جنہیں بذریعہ پیراشوٹ یا کسی دیگر خفیہ ذریعے سے فرانس میں اُتارا جاتا تھا وہ اپنے آپ کو یقین دلا کے جاتے تھے کہ وہ زندہ واپس نہیں آسکیں گے۔

عقل تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے کہ کوئی عورت دشمن کے ملک میں اِن حالات میں جو اُوپر بیان کیے گئے ہیں ایسے خطرناک مشن پر جا سکتی ہے، لیکن اب جو خفیہ ریکارڈ سامنے آئے ہیں ان میں دو عورتوں کے نام ملتے ہیں جو فرانس میں داخل ہوئیں اور انہوں نے جاسوسی اور تباہ کاری کی۔ ایک فرانسیسی عورت تھی جس کا نام یونی ریلا تھا۔ وہ فرانس کے ساحل پر کشتی میں سے اتری تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ فرانس میں "تحریکِ مزاحمت" کے ایک خفیہ اڈے تک پہنچ گئی۔ ایک دو سال سابوتاژ اور جاسوسی کرتی رہی اور پکڑی گئی۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے اُس نے دو جرمن سپاہیوں کو ریوالور سے زخمی کیا۔ یہ سپاہی اُسے رائفلوں کے بٹوں سے مار رہے تھے۔ اُسے بے ہوشی کی حالت میں پکڑا گیا۔ ایک لمبے عرصے تک اُسے ان تمام اذیتوں سے گزارا گیا جو جرمنوں نے ایجاد کی تھیں لیکن اس عورت نے جرمنوں کو کچھ نہ بتایا۔ آخر اسے گیس چیمبر میں گیس سے ہلاک کر دیا گیا۔

قارئین کے لیے یہ انکشاف عجیب ہوگا کہ دوسری عورت جو برطانیہ کی سیکرٹ سروس کی طرف سے ایک گوریلا پارٹی کے ساتھ وائرلیس آپریٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے فرانس میں اتاری گئی تھی وہ مسلمان تھی اور سلطان ٹیپو شہید کی اولاد کی اولاد میں سے تھی۔ اُس کا نام نورالنساء تھا۔ برطانیہ کی سیکرٹ سروس کے ریکارڈ میں اُس کا نام نُور عنایت خان تحریر ہے۔ عنایت خان اس کے والد تھے۔

سلطان ٹیپو کے بارہ بیٹے تھے۔ سلطان کی شہادت (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کے وقت اُس کے بیٹوں کی تعداد چوبیس تھی۔ سلطان

ٹیپو شہید برِصغیر میں سلطنتِ اسلامیہ کی ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ بھی کمان سے نکل گیا تو برِصغیر میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے راستے میں کوئی مزاحمت نہ رہی۔ سلطان ٹیپو شہید کی اولاد کچھ برِصغیر میں بکھر گئی اور زیادہ تر افراد بنگال چلے گئے۔ انہیں اپنا غلام بنانے کے لیے انگریزوں نے ان کی پنشنیں مقرر کر دی تھیں۔ ان میں بعض برِصغیر سے نکل گئے۔ تاریخ میں سلطان ٹیپو کے دو بیٹوں کا سراغ ملتا ہے جو انگلستان چلے گئے تھے۔ ان میں ایک جامع الدین تھا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ بڑے بھائی کا نام غلام محمد تھا۔ اس کی صحیح عمر معلوم نہیں، نوجوانی کی عمر میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس وقت ملکہ وکٹوریہ کا راج تھا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو شاہی مراعات دیں اور انہیں انگلستان کی شہریت بھی دی۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ نورالنساء (نُور عنایت خان) کے والد سلطان ٹیپو کے کون سے بیٹے کی اولاد کی اولاد تھے۔ ولیم سٹیونسن نے اپنی اُس کتاب میں جس میں نور کا کارنامہ لکھا ہے یہ تحریر کیا ہے کہ نُور کے والد کو ۱۹۱۲ء میں زارِ روس نے روس میں اس مقصد کے لیے بُلایا تھا کہ اُسے تصوف (صوفی ازم) پڑھائیں۔ نور کریملن (رُوس) میں پیدا ہوئی تھی۔ سٹیونسن نے اپنی کتاب میں نُور کے متعلق لکھا ہے:

"وہ شیرِ میسور کی نسل میں سے تھی جو جنوبی ہندوستان کا آخری مسلمان تاجدار تھا۔"

نور عنایت خان کی ماں امریکی تھی۔ اُس کے والد اسلام کے اِس اصول کے علمبردار تھے کہ غیر انسانی حربوں کو محبت اور بُردباری کا ہتھیار بیکار کر دیتا ہے۔ نُور بھی اسی فلسفے کی قائل تھی۔ والد نے اُسے تصوف کی تعلیم دی تھی۔ نُور نے جب جوانی میں قدم رکھا تو جرمنی نازی ازم کی گرفت میں آگیا تھا۔ جرمنی کے ڈکٹیٹر حکمران ہٹلر نے اپنی قوم کو نازی بنا کر اُس کے ذہن میں یہ ڈالا کہ جرمن قوم دنیا کی تمام

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanpoint

قوموں سے برتر اور افضل ہے اور ساری دنیا پر حکمرانی کا حق صرف جرمن قوم کو حاصل ہے۔ اپنی قوم میں برتری کا یہ احساس پیدا کر کے ہٹلر نے دوسری قوموں کے خلاف نفرت پیدا کی اور تشدد کی تعلیم دی۔ اُس وقت یورپی اقوام صوفی ازم کے اصولوں کو اپنانے لگی تھیں۔ ہٹلر نے جرمنی میں صوفی ازم کے پرچار کی ممانعت کر دی۔ نُور کہتی تھی کہ صوفی ازم نازی ازم کو ختم کر دے گا۔ بہرحال تحریروں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ عنایت خان عالم تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی نُور کو بھی علم و فضل سے مالا مال کر دیا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے نُور ہندوستان گئی۔ وہاں سے فرانس چلی گئی۔ اُس وقت تک وہ انگریزی زبان میں بچوں کے لیے کہانیوں کی متعدد کتابیں لکھ چکی تھی جو لندن کے ایک ناشر نے چھاپی تھیں۔ اُس کی کہانیاں پریوں سے متعلق رکھتی تھیں اور ان میں پیار اور محبت کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ جب فرانس گئی تو اسے ریڈیو پیرس نے بچوں کے پروگرام کے لیے رکھ لیا۔ فرانسیسی زبان میں اسے انگریزی زبان جتنی مہارت تھی۔ وہ ریڈیو پیرس سے بچوں کو کہانیاں سُنانے لگی، اور اس دوران جرمنی نے فرانس پر یلغار کر دی۔ فرانسیسیوں نے اپنے ملک کے لیے میگنٹ لائن کے نام سے دفاعی انتظامات کر رکھے تھے جنہیں وہ ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے، بلکہ ساری دنیا فرانسیسیوں کی میگنٹ لائن کو ناقابلِ تسخیر سمجھتی تھی مگر جرمنی کے ٹینکوں کے آگے یہ ناقابلِ تسخیر دفاع ریت کی ڈھیریاں ثابت ہُوا۔ فرانسیسی قوم اور فوج کا مورال ریزہ ریزہ ہو گیا۔ فوج بھی بھاگ اٹھی۔ جرمنی کی فوج نے تشدد کی پالیسی اختیار کی اور جو فرانسیسی بھاگ نہ سکے انہیں دہشت زدہ کر کے اپنا حامی اور مُخبر بنانے لگے۔

نور عنایت خان کی عمر پچیس سال تھی اور غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ فرانس میں پھنس گئی۔ لندن کے اس ناشر نے جو اُس کی

کتابیں چھاپا کرتا تھا اُسے ڈرامائی طریقے سے فرانس سے فرار کرایا اور لندن لے گیا۔ نُور کے دل میں انگریزوں کی اتنی محبت نہیں ہونی چاہیے تھی جتنی کا اُس نے عملاً اظہار کیا، کیونکہ انگریز اس کے جدِ امجد کے دشمن تھے۔ سلطان ٹیپو انگریزوں کے خلاف لڑتا شہید ہُوا تھا،

لیکن نُور کے دل میں نازی جرمنی کی جو نفرت تھی وہ غالب آگئی۔ وہ تشدد اور استبداد کے خلاف لڑنا چاہتی تھی۔ برطانیہ کی فضائیہ (رائل ایئر فورس) کو عورتوں کی ضرورت تھی۔ نُور نے اپنی خدمات پیش کیں تو اسے کمشن دے کر ایئر فورس میں افسر بنا دیا گیا۔ ایئر فورس کے مرد افسروں نے مشاہدہ کیا کہ نور عنایت خان میں کوئی اور ہی صلاحیت ہے اور وہ ایئر فورس کی افسری سے بہتر کام کر سکتی ہے۔

۱۹۴۱ء کا آغاز تھا۔ فرانس میں جو شہری رہ گئے تھے انہوں نے "تحریکِ مزاحمت" قائم کر کے جرمنوں کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ برطانیہ کی سیکرٹ سروس نے سوچا کہ جن گوریلا پارٹیوں کو وہ فرانس میں اُتارتے ہیں ان کے ساتھ وائرلیس کا رابطہ ہوتا ہی نہیں اور اگر کسی پارٹی کے ساتھ ایسا انتظام ہو جاتے تو یہ اتنا ناقص ہوتا ہے کہ جرمنی کی سیکرٹ سروس اس کا سراغ لگا لیتی ہے۔ اس رابطے کو بہتر بنانے کے لیے یہ سوچا گیا کہ گوریلا پارٹیوں کے ساتھ ایک عورت ریڈیو آپریٹر بھیجی جائے۔ اس تجربے کے لیے سب سے پہلے نور عنایت خان پر نظر پڑی۔ اس جواں سال خاتون میں ایک خوبی تو یہ دیکھی گئی تھی کہ وہ اردو، انگریزی، روسی اور جرمن زبان بولتی اور سمجھتی تھی۔ اُس میں یہ خوبی بھی تھی کہ بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ اس کی خوبصورتی اور شخصیت میں جو رعب و جلال ہے اس سے کسی کو شک نہیں ہوگا کہ یہ انگریزوں کی بھیجی ہوئی تخریب کار ہے۔

اپریل ۱۹۴۲ء کے ایک روز اُسے حکم ملا کہ وہ ہوٹل وکٹوریہ (لندن) کے فلاں نمبر کمرے میں پہنچے۔ وہ گئی۔ وہاں اُسے فوج کا ایک کپتان

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ملا جس نے اُس کا انٹرویو لیا۔ اُس نے زیادہ تر سوال جو نُور سے پُوچھے وہ اس کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ نُور نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ــــ "میری جڑیں معلوم نہیں کہاں ہیں۔ کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ مجھ پر ماں کی طرف سے امریکی اثرات بھی ہیں۔ میرا بچپن روسی ہے اور میری نوجوانی فرانسیسی۔ جذباتی لحاظ سے میری وابستگی ہندوستان کے ساتھ ہے جو شدید ہے۔"

یہ انگریز کپتان اُس کا انٹرویو لیتا رہا۔ بات جب وفاداری پر آئی تو نُور نے بے تکلفی سے کہا ــــ "میں ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں سرگرمی سے شریک ہوں گی۔"

اس بے باک جواب نے کپتان کو بہت متاثر کیا۔ اُس نے رپورٹ میں لکھا کہ اس عورت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کی زبان اور دل کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ اس کی شخصیت گٹھی ہوئی اور کردار پُختہ ہے۔ انگریز کپتان نے اُسے بتایا کہ اُسے جرمنوں کے خلاف کام کرنا پڑے گا۔ نور رضامند ہو گئی۔ کپتان نے اُسے کہا کہ اگر وہ جرمنوں کی تنظیم "گیسٹاپو" کے ہاتھ چڑھ گئی تو وہ اُسے ایسی اذیتیں دیں گے جس کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ نور عنایت خاں نے یہ خطرہ بھی قبول کر لیا۔ اُسے رائل ایئر فورس سے سبکدوش کر دیا گیا۔

فیصلہ کیا گیا کہ نُور کو فرانس بھیجا جائے تاکہ وہاں کی "تحریکِ مزاحمت" کے ساتھ خفیہ کام کرے اور ریڈیو ٹیلی گرافی کے ذریعے لندن کی سیکرٹ سروس کو وائرلیس پیغامات دیتی رہے۔ اُسے جب ایئر فورس میں لیا گیا تھا تو اُسے ریڈیو ٹیلی گرافی کی ٹریننگ دی گئی تھی، مگر اُسے جب سیکرٹ سروس کے بڑے افسر کے سامنے لے جایا گیا تو اُس نے نُور کا انٹرویو لے کر اُسے کہا کہ تم اس پُرخطر کام کے لیے موزوں نہیں ہو۔ اُس نے کہا ــــ "مس نُور! تم ادیب ہو اور تم بچّوں کے پروگرام کے لیے ہی موزوں ہو۔ جنگ کے بعد جب بچّے دنیا کی تباہی دیکھیں گے تو تم انہیں

ذہنی طور پر سنبھال لو گی۔ میرا خیال ہے تمہارا اصل کام جنگ کے بعد شروع ہو گا۔"

"مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں" ــــ نُور نے کہا ــــ "میں آج کے حالات کے لیے موزوں ہوں..... پیرس میں۔"

اس افسر نے نیم دلی سے نُور کو ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ بعد میں انکشاف ہوا تھا کہ نُور اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے جس مشن کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے وہ کیا ہے اور اس میں خطرے کیا ہیں۔ انگلستان میں سٹیفنسن نام کا ایک آدمی ہے جو دوسری جنگِ عظیم کا ہیرو کہلاتا ہے۔ اُس نے ساری دنیا میں برٹش سیکرٹ سروس کی انٹیلی جنس کا جال پھیلایا تھا۔ جنگ کے دوران فرانس میں جاسوسی اور تخریب کاری اُسی کی ہدایت کاری سے کامیاب ہوئی تھی۔ (نوٹ فرمائیے کہ کتاب کے مصنّف کا نام سٹیونسن ہے اور کتاب کے ہیرو کا نام سٹیفنسن)۔

۱۹۳۴ء میں نور عنایت خان ہندوستان میں اپنے والد کے گہرے دوست نواب آف بھوپال کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ سٹیفنسن انگلستان سے کسی سرکاری مشن پر ہندوستان آیا تھا۔ وہ نواب آف بھوپال کے ہاں شکار کھیلنے گیا۔ نُور بھی ساتھ گئی۔ وہ شیر اور بڑے جانوروں کے شکار کی شوقین تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر اُنیس سال تھی۔ اُس کی ملاقات سٹیفنسن سے ہوئی۔ اُس نے نُور کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ لڑکی حیران کن حد تک خوبصورت ہے اور اس قدر معصوم کہ اس کے اخلاق اور کردار کو بگاڑا نہیں جا سکتا۔ اُس نے اُسی وقت دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔

آٹھ سال بعد جب جنگِ عظیم زوروں پر تھی سٹیفنسن نے نُور کی ضرورت محسوس کی۔ انگلستان میں اُس کا انٹرویو لیا گیا اور اُس کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ چند ماہ بعد اُسے فرانس بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ فرانس میں رہنے کے لیے اُس کا نام جین میری ریجنیئر رکھا گیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سیکرٹ سروس میں استعمال کے لیے اُسے "میڈلن" نام دیا گیا۔ یہ اُس کی ایک کتاب کا عنوان تھا جس میں بچوں کی کہانیاں تھیں۔ اُس کے لیے پیرس کا راشن کارڈ اور شناختی کارڈ تیار کیا گیا۔ یہ کارڈ ماہر جعل سازوں نے تیار کیے تھے۔ اس کے لیے کپڑے تیار کیے گئے جو اُن دنوں فرانس میں عورتیں پہنتی تھیں۔ یہ خاص طور پر دیکھا گیا کہ اس لباس پر جو بٹن لگائے گئے ہیں وہ انگلستان کے بنے ہوئے نہیں فرانس کے بنے ہوتے ہیں۔ جاسوس عموماً انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے پکڑے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی جاسوس دشمن کے ملک میں شک میں پکڑا گیا تو اُس کے خلاف کوئی قابل اعتبار شہادت نہ ملی۔ اُس کی جیب سے اپنے ملک کا بس کا ٹکٹ نکل آیا جس سے ثابت ہو گیا کہ یہ شخص فلاں ملک سے آیا ہے۔

نور عنایت خان کو لباس اور حلیے کے لحاظ سے اُس وقت کی فرانسیسی شہری بنا دیا گیا جب فرانس کا ہر شہری جرمنوں سے دہشت زدہ رہتا اور راشن کی قلت محسوس کرتا تھا۔ فرانس میں اُسے کسی کے بچوں کی نرس کے بہروپ میں رہنا تھا۔ پھر اسے چار قسم کی گولیاں دی گئیں۔ ایک کا استعمال یہ تھا کہ وہ پکڑی جائے تو ایک گولی پکڑنے والوں کی چائے کی پیالیوں میں ڈال دے۔ اس سے فوراً انسان بے ہوشی کی نیند سو جاتا تھا۔ دوسری قسم کی گولیاں اپنی نیند اُڑانے کے لیے تھیں۔ ان کی ضرورت ہنگامی حالات میں محسوس ہوتی تھی جب کام زیادہ اور نیند کا غلبہ ہوتا تھا۔ تیسری گولی اس مقصد کے لیے تھی کہ اگر کسی کو بیماری کا دھوکہ دینا ہو تو ایک گولی کھالی جاتی تھی۔ اس سے قے شروع ہو جاتی تھی۔ چوتھی اور خطرناک گولی خودکشی کے لیے تھی۔ ان گولیوں کے علاوہ اُسے ایک وائرلیس سیٹ (ٹرانسمٹر) دیا گیا۔ یہ چھوٹے سائز کا تھا۔ نور کو زیادہ وزنی سامان نہ دیا گیا کیونکہ وہ قدآور اور تنومند عورت نہیں تھی۔ اُس کا قد پانچ فٹ تین

انچ اور وزن ایک من دس سیر تھا۔

نور (خفیہ نام میڈلن) کو اُس گوریلا تنظیم کے ساتھ کام کرنا تھا جس نے مقبوضہ فرانس کے بہت بڑے علاقے کو زد میں لے رکھا تھا۔ اس کا خفیہ ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا اور اس کی پارٹیاں جنگلوں اور بستیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پارٹیاں بجلی کے تار کاٹ کر بجلی کا نظام درہم برہم کر دیتی تھیں اور سابوتاژ (تباہ کاری) کرتی تھیں۔ اس تنظیم کی ضروریات کی فہرست بہت طویل ہوتی تھی جو خفیہ طریقے سے انگلستان سے پوری کی جاتی تھیں۔ اس تنظیم کی کارگزاریوں نے جرمنی کی سیکرٹ سروس کو پریشان کر دیا۔ فرانس میں جرمنی کے جاسوس ہر شہری کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے پکڑ دھکڑ اور ظلم و تشدد میں اضافہ کر دیا۔ نور کو اس گوریلا تنظیم کی پارٹیوں کے درمیان وائرلیس ٹیلی گرافی سے رابطہ قائم کرنا تھا اور فرانس سے لندن برٹش سیکرٹ سروس کو بھی اطلاعیں اور معلومات پہنچانی تھیں۔

نور کو رہرسل اور امتحان کے بڑے ہی کٹھن مرحلے سے گزارا گیا۔ اُسے "گیسٹاپو" کی تفتیش کے امتحان میں سے بھی گزار گیا جو یوں تھا کہ فرض کیا گیا کہ وہ پکڑی گئی ہے۔ اُس نے اپنے متعلق وہ جھوٹی کہانی سُنانی جو اُسے ازبر کرائی گئی تھی۔ اُسے ایک کمرے میں بٹھا کر اُس کی آنکھوں کے قریب بہت تیز روشنی والے بلب لگا دیئے گئے۔ اُس کے سامنے چھ سات آدمی کھڑے ہو گئے جنہوں نے اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا ہی اذیت ناک ہوتا ہے۔ جرح در جرح اور آنکھوں کے بالکل قریب بلبوں کی تیز روشنی دماغ ماؤف کر دیتی ہے۔ مشتبہ کی زبان اور عقل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نور کو کئی گھنٹے اس مرحلے میں رکھا گیا۔ آخر میں دیکھا گیا کہ وہ اپنی جھوٹی کہانی سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہوئی۔

اُسے خفیہ (کوڈ) الفاظ بلکہ حروف یاد کراتے گئے۔ تین تین چار چار

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حروف کا پورا جملہ بنتا تھا۔ مثلاً کیو۔ یو۔ اے کا مطلب یہ تھا ــــ "ٹرانسمشن بند کی جا رہی ہے کیونکہ اردگرد خطرہ ہے۔ اگر ممکن ہوا تو ٹرانسمشن جاری رکھنے کی کوشش کی جائے گی" ــ ایسے بہت سے حروف کے مجموعے تھے۔ ان کے متعلق دشواری یہ تھی کہ نور انہیں کہیں نوٹ کر کے اپنے پاس محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ حروف کے مجموعوں کی یہ طویل فہرست اُسے زبانی یاد کرنی تھی جو اُس نے کر لی۔ اس کے علاوہ اُسے مختلف جگہوں کے ساتھ وائرلیس پر رابطہ قائم کرنے کے طریقے بھی جو ایک دوسرے سے مختلف تھے زبانی یاد کرنے تھے۔ اُسے اپنے دفاع میں چاقو استعمال کرنے کے طریقے بھی سکھائے گئے۔ بغیر چاقو کے یعنی خالی ہاتھوں سے لڑنا اور اپنے دشمن کو بے کار کرنا بھی سکھایا گیا۔ مثلاً اُسے سکھایا گیا کہ ہتھیلی تھوڑی کے نیچے اُوپر کو مار کر دشمن کا جبڑا توڑا جا سکتا ہے۔ گھٹنہ پیٹ میں کس طرح مار کر دشمن کو بیہوش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کئی ایک داؤ سکھائے گئے۔

نور کو ہر پہلو سے تیار کر دیا گیا۔ اُس کی صرف یہ خامی سب کو کھٹک رہی تھی کہ اُس کا حُسن غیر معمولی تھا اور اُس کے جسم میں جو کشش تھی اُسے دیکھ کر ہر کوئی ٹھٹھک جاتا تھا۔ اس لحاظ سے نور اپنے آپ کو گمنام نہیں رکھ سکتی تھی۔ ضرورت یہ تھی کہ وہ عام سی شکل و صورت کی عورت ہوتی جس کی طرف کوئی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا لیکن نور کے جو دوسرے اوصاف تھے اور اُس کی جو صلاحیتیں تھیں وہ کسی اور میں کم ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔

ہو سکتا ہے قارئین اس سوچ میں پڑ جائیں کہ جاسوس عورتیں عموماً اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ دشمن کے اعلیٰ حکام کو اپنے حُسن کے جال میں اُلجھا کر اُن سے راز حاصل کر لیا کرتی ہیں۔ پھر نور کے حُسن پر کیوں اعتراض کیا گیا؟ مثلاً جنگ عظیم کے دوران ماتا ہری نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ کہتے ہیں وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے

سزائے موت سُنانے والے افسر کی زبان کانپ رہی تھی لیکن ماتا ہری اور نور عنایت خان کے فرائض میں فرق تھا۔ نور کے مشن کی نوعیت ایسی تھی جو اُسے چھُپ کر کرنے تھے جب کہ ماتا ہری کو سوشل اور ملٹری حلقوں میں معزز عورت کے رُوپ میں گھومنا پھرنا اور اعلیٰ حکام سے دوستانہ گانٹھنا تھا۔ نور کو خاص طور پر احتیاط کرنی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی دوستانہ گانٹھنے کی کوشش نہ کرے۔

وہ لمحہ آ گیا جب نور کو موت کے اِس سفر پر روانہ ہونا تھا۔ رات کے وقت اُسے پُرانے دَور کے ایک سُست رفتار طیارے "لائسنڈر" پر جانا تھا۔ اس طیارے کی دو ہی سیٹیں تھیں۔ ایک پائلٹ کے لیے دوسری پسنجر کے لیے۔ اس طیارے کو فرانس کے ایک ویران علاقے میں اُترنا، نور کو اُتارنا اور فوراً اُڑ آنا تھا۔ فرانس کی گورلا تنظیم اور وہاں کی "تحریکِ مزاحمت" کو خفیہ ذرائع سے بتا دیا گیا تھا کہ عورت آ رہی ہے۔ "تحریکِ مزاحمت" نے جگہ بتا دی تھی جہاں طیارے کو اُتارنا تھا۔ یہ پیشِ نظر رکھیے کہ "لائسنڈر" کے اُترنے اور اُڑنے کے لیے کسی لمبے چوڑے "رن وے" کی ضرورت نہیں تھی۔ تین سو گز لمبا میدان کافی تھا۔ یہ چھوٹا سا سُست رفتار طیارہ تھا۔

روانگی کے وقت برطانیہ کے ریڈیو، بی۔ بی۔ سی، نے اپنے ایک پروگرام کے دوران اعلان کیا ــ "یاسمین بنسری بجا رہی ہے"۔

فرانس میں "تحریکِ مزاحمت" کے خفیہ اڈے نے یہ اعلان اپنے ریڈیو پر سُنا اور "میڈلن" (نور) کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔ بی۔ بی۔ سی نے اشارہ دے دیا تھا۔

آخری رات نور نے اپنے آپ کو اور ان اشیاء کو جو وہ ساتھ لے جا رہی تھی، اچھی طرح دیکھا۔ اُس نے اپنے بیگ میں "۳۸۔ ریوالور ڈال رکھا تھا جو اُسے فرانس پہنچ کر کہیں چھپا دینا تھا۔ اُسے ایک پیراشوٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھی ساتھ لے جانا تھا تاکہ طیّارہ کسی وجہ سے اُتر نہ سکے تو نُور پیراشوٹ کے ذریعے اُتر جائے ..... نصف شب کے بعد دو بجے اُس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ ایک جانے پہچانے آدمی نے کہا ــــ ’’جانے کا وقت ہو گیا ہے‘‘ ــــ وہ تیار بیٹھی تھی۔ اُس کے ساتھ چلی گئی۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کا سامان اور ریڈیو ٹرانسمٹر پیراشوٹ کے ذریعے بعد میں پھینکا جائے گا۔

چاند پُورا تھا۔ نُور ایک جگہ پہنچی جہاں ’’لائسنڈر‘‘ طیّارہ کھڑا تھا۔ اُس کے پائلٹ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُسے طیّارہ دشمن کے پیٹ میں اُتارنا تھا۔ نُور طیّارے میں بیٹھی تھی۔ انجن سٹارٹ ہُوا۔ طیّارہ چلا اور ذرا ہی دیر بعد زمین سے اُٹھ گیا۔ فرانس میں جرمن سیکرٹ سروس نے ایسا جال پھیلا دیا تھا جسے دیکھ کر یہی کہا جا سکتا تھا کہ نور عنایت خان یقینی موت کے منہ میں جا رہی ہے۔ اُن دنوں فرانس سے جو اطلاعیں آ رہی تھیں وہ اچھی نہیں تھیں۔ ’’تحریکِ مزاحمت‘‘ نے برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو خبردار کیا تھا کہ اگلی اطلاع تک فرانس میں نہ کسی آدمی کو اُتاریں نہ کوئی سامان بھیجیں کیونکہ جرمن سیکرٹ سروس اُن جگہوں کے اردگرد سرگرم ہو گئی ہے جہاں سامان اور انسان اُتارے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انگلستان سے سامان اُتارا جاتا رہا اور کینیڈا کے دو جاسوس بھی اُتارے گئے۔

بعد میں تحقیقات ہوئی تھی کہ یہ وارننگ ملنے کے باوجود نُور کو کیوں اور کس کے حکم پر بھیجا گیا تھا۔ چونکہ خفیہ کارروائیوں کے متعلق تحقیقات بھی خفیہ رکھی گئی اس لیے پتہ نہ چل سکا کہ تحقیقات کے نتائج کیا تھے۔ صرف یہ پتہ چل سکا کہ گوریلا تنظیم نے پیغام بھیجا تھا کہ ایک وائرلیس اپریٹر کو فوراً بھیجو۔ بہرحال یہ شہادت مل گئی کہ گوریلا تنظیم اور ’’تحریکِ مزاحمت‘‘ کے ساتھ غداری ہو گئی تھی۔ اُن کے اپنے ہی کسی ساتھی

نے مخبری کر دی تھی جس کے نتیجے میں جرمن سیکرٹ سروس شدّت سے سرگرم ہو گئی۔ اس کا ایک ثبوت تو نُور کو فرانس میں اُترتے ہی نظر آ گیا۔ نوجوان پائلٹ نے بڑی مہارت اور دلیری سے طیّارہ فرانس میں اُس جگہ اُتار دیا جہاں اتارنا تھا۔ انجن چلتا رہا۔ نُور خاموشی سے اُتری۔ پائلٹ نے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا، طیّارہ دوڑا دیا اور زمین سے اُٹھا لے گیا۔ یہ ایسی جگہ تھا جہاں جرمنوں کی فوج نہیں تھی پھر بھی وہاں رُکا نہیں جا سکتا تھا۔ نُور نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں اُس کے استقبال کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا ــــ یہ ۱۲ جون ۱۹۴۳ء کی سحر تھی۔

نُور کو خطرے کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ زیادہ دیر رُکی نہیں۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ استقبال کے لیے کوئی نہ آئے تو وہ کہاں جائے۔ وہ قریبی ریلوے سٹیشن گئی اور ریل گاڑی سے پیرس چلی گئی۔ اُسے ایمیلے گیری نام کے ایک آدمی کا پتہ دیا گیا تھا جو ’’تحریکِ مزاحمت‘‘ کے اس سیکٹر کا کمانڈر تھا۔ نُور اُس کے گھر پہنچی تو وہ اُسے ایک پروفیسر کے پاس لے گیا۔ پروفیسر نے پودوں کی نرسری میں ایک وائرلیس سیٹ چھپا کر رکھا ہُوا تھا۔ نُور نے اس سیٹ سے لندن کو خفیہ حروف کا پیغام بھیجا اور بتایا کہ وہ صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ لندن والوں کے انتظامات بڑے اچھے تھے۔ پروفیسر کو یہ بھی معلوم تھا کہ نُور کا سامان اور ٹرانسمٹر بذریعہ پیراشوٹ پھینکے جائیں گے۔ دو ہی روز بعد ایک فارم میں رات کے وقت ایک طیّارہ سامان پھینک گیا جس میں نُور کے تین ٹرانسمٹر تھے۔ یہ سامان رات کو ہی اٹھا کر ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔

اُسی روز کینیڈا کے وہ دو جاسوس جو چند ہی روز پہلے فرانس میں اُتارے گئے تھے پکڑے گئے۔ وہ یونی رودیلا نام کی اُس عورت کے ساتھ تھے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ یہ تینوں کہیں جا رہے تھے۔ ایک موڑ مُڑے تو آگے سڑک پر چند اشیاء رکھ کر سڑک بند کی گئی تھی۔ یہ تینوں سمجھ گئے کہ یہ انہیں پکڑنے کا اہتمام ہے۔ انہوں نے گاڑی روکی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

نہیں۔ رکاوٹ سے ٹکر مار کر راستہ صاف کیا اور رفتار بڑھا دی کیمیر سے جرمنوں کی ایک فوجی کار نکلی جوان کے تعاقب میں گئی۔ کار میں سے فائرنگ ہوئی۔ رودیلا زخمی ہو کر اپنی گاڑی سے نیچے آپڑی۔ اُس کے ساتھی بھی پکڑے گئے۔ رودیلا کو دو جرمن فوجیوں نے رائفلوں کے بٹوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ رودیلا نے ریوالور نکالا اور دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنا لیا، پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اُسے بہت اذیتیں دی گئیں لیکن اُس نے کچھ نہ بتایا۔ وہ جب ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تو اُسے گیس چیمبر میں داخل کر کے گیس چھوڑ دی گئی۔ اُس کے ساتھیوں کا انجام بھی اسی جیسا ہُوا۔

جو پروفیسر نُور کو اپنے ساتھ لے گیا تھا وہ دس روز بعد پکڑا گیا اس کے فوراً بعد "تحریکِ مزاحمت" کے بہت سے سرگرم رکن پکڑے گئے۔ اس کے ساتھ ہی لندن میں یہ پیغام پہنچا کہ فرانس میں زمین دوز تنظیم مکمل طور پر ختم ہو گئی ہے۔ اس کے تمام افراد جرمنوں کی بے رحم حراست میں تھے۔ یہ تنظیم فعال اور مؤثر تھی۔ ٹرانسمٹر جو اس تنظیم کے پاس تھے وہ جرمنوں نے قبضے میں لے لیے تھے۔ صرف ایک ٹرانسمٹر تھا جو پیغامات نشر کر رہا تھا۔ یہ نُور کا تھا۔ یہ نُور ہی تھی جس نے برطانیہ کی سیکرٹ سروس کو اطلاع دی تھی کہ اُن کا سب سے بڑا رنگ جرمنوں نے توڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جرمن سیکرٹ سروس کامیاب ہو گئی تھی اور اس خفیہ جنگ میں برطانیہ کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اب وہاں کسی بھی زمین دوز کارکن کا محفوظ رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

برٹش سیکرٹ سروس نے نُور کو وائرلیس پر کوڈ میں یہ پیغام دیا کہ فلاں جگہ ایک طیارہ اُترے گا۔ اُس سے واپس انگلستان آ جاؤ۔ یہ انگریز افسروں کی دانشمندی تھی کہ وہ نُور جیسی قیمتی عورت کو جرمنوں کے ہاتھوں چڑھنے سے بچانا چاہتے تھے۔

"نہیں"۔۔۔ نور عنایت خان نے پیغام کا جواب دیا۔ "پیرس

سیکٹر میں میرے سوا اور کوئی نہیں رہا جو یہاں کی اطلاعیں دے سکے۔ میں یہاں کے بچے کھچے آدمیوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں تاکہ ایک رنگ تیار ہو جائے۔"

برطانیہ کی سیکرٹ سروس کا اعلیٰ افسر نُور کو ہر قیمت پر واپس بلانے کا فیصلہ کیے ہوتے تھا۔ وہ کہتا تھا کہ نُور کسی بھی روز گرفتار ہو جائے گی۔ فرانس میں اب گرفتاری، اذیت اور موت کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اُس نے نُور کو ایک اور وائرلیس پیغام دیا جس میں کہا کہ تم واپس نہیں آنا چاہتی تو پیغام دینے چھوڑ دو کیونکہ تمہارے ٹرانسمٹر کا سراغ لگانے کے لیے جرمنوں نے تمام تر سائنسی اور انسانی ذرائع تمہارے پیچھے ڈال رکھے ہیں۔ وہ تمہاری ٹرانسمشن سن رہے ہیں، مگر نُور نے اپنے فرض میں کوتاہی گوارا نہ کی۔ جہاں اُسے کچھ معلوم ہُوا اُس نے لندن کو پیغام دے دیا۔

وہ چونکہ جنگ سے پہلے خاصا عرصہ پیرس میں رہی تھی اس لیے اُس نے اپنے اُس وقت کے جاننے والوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اُسے ایک سکول ٹیچر مل گئی جو اُسے اپنے گھر لے گئی۔ اس سکول ٹیچر کی وساطت سے اُسے چند اور سہیلیاں مل گئیں۔ وہ ہر ایک کے گھر میں دو دو چار چار روز کے لیے مہمان ٹھہری۔ اُس کے پاس بائیسکل تھی اور چھوٹا سا ایک اٹیچی کیس۔ کوئی بھی شک نہیں کر سکتا تھا کہ معمولی سے اس اٹیچی کیس میں نُور نے ایک ٹرانسمٹر اس طریقے سے چھپا رکھا ہے کہ کوئی اس کی تلاشی لے تو بھی ٹرانسمٹر نہ پکڑا جائے۔ نُور اپنی جس بھی سہیلی کے ہاں ٹھہری اُسے اپنی اصلیت نہ بتائی۔ رات کو جب اُس کے میزبان سو جاتے تو وہ پیغام نشر کرتی تھی۔

اُس نے چار ماہ اسی طرح جگہ جگہ رہ کر اپنا فرض ادا کیا اور جنگ کے بعد جب جرمنی نے ہتھیار ڈالے اور جرمن سیکرٹ سروس کے سراغرساں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پکڑے گئے تو انہوں نے زبانی اور تحریری ریکارڈ دکھا کر بھی بتایا کہ اس لڑکی نے ایسے ایسے خطرے مول لیے تھے جن سے سیکرٹ سروس کے تجربہ کار افسر بھی دنگ رہ گئے تھے۔ مرد بھی ایسی غیر معمولی دلیری کے مظاہروں سے گھبراتے ہیں۔ جرمن سراغرسانوں کو یہ سراغ مل گیا تھا کہ جس کے ریڈیو ٹیلیگراف پیغام اُن کے آلات میں سُنے جاتے ہیں اُس کا نام میڈلن ہے لیکن یہ سراغ نہیں ملتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ اگر کسی جگہ کی نشاندہی ہو بھی جاتی تو وہاں میڈلن نہیں ہوتی تھی۔ میڈلن کے شک میں جرمنوں نے کئی عورتوں کو پکڑا۔ اُن کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کیا۔ اذیتوں کی آخری حد آزمائی مگر میڈلن نہ ملی۔

نُور عنایت خان سے ایک غلطی ہو گئی۔ اُس نے "تحریک مزاحمت" کے چند ایک افراد کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں اپنا رول بتا کر انہیں منظم کرنے لگی۔ وہ جان نہ سکی کہ اب اس تحریک میں غدار اور مخبر بھی آ گئے ہیں۔ دیانتدار اور فرانس پر مر مٹنے والے کارکن گرفتار ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی نے نُور کے خلاف مخبری کر دی پھر بھی نُور جرمنوں کے ہاتھ نہ آئی۔ جرمنوں نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے فرانس کے دیہاتی علاقوں میں اعلان کر دیا کہ "تحریکِ مزاحمت" کے جو افراد پکڑے جائیں گے اُن کے ساتھ جاسوسوں اور تخریب کاروں جیسا سلوک نہیں ہوگا بلکہ انہیں فرانس کی فوج کا سپاہی تصوّر کر کے انہیں جنگی قیدیوں کی حیثیت اور مراعات حاصل ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں گرفتاری کے فوراً بعد جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔

فرانسیسیوں نے دیکھ لیا تھا کہ جرمن سیکرٹ سروس کے جال سے اب کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا، چنانچہ انہوں نے جنگی قیدیوں کی مراعات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ دیہاتی علاقوں میں جرمنوں کو برطانوی ساخت کے پیراشوٹ اور کچھ

اور سامان بھی بکھرا ہُوا ملا۔ دیہاتیوں نے جرمنوں کو بتا دیا کہ یہ سامان کیسے آیا ہے اور جن کے پیراشوٹ پڑے ہیں وہ آدمی کہاں ہیں۔ اسی دوران "تحریکِ مزاحمت" کا ایک لیڈر جو جیل خانے میں قید تھا اذیتوں اور قید سے تنگ آ گیا تھا اور اُس پر دہشت کا بھی غلبہ تھا، اُس نے یہ راز اُگل دیا کہ برطانیہ کے طیارے گوریلا تنظیم اور "تحریکِ مزاحمت" کے لیے سامان کس کس جگہ پھینکتے ہیں۔ اُس نے وہ نقشے بھی اپنے گھر سے نکال کر دے دیئے جن پر نشان لگے ہوئے تھے۔ ایک نشان اُن جگہوں پر تھے جہاں گوریلوں نے تباہی بپا کی تھی۔ ان میں گولہ بارود کے ذخیرے تھے اور فوج کے دیگر سامان کے ٹرک وغیرہ بھی تھے۔ دوسری قسم کے نشان اُن جگہوں پر تھے جہاں سابوتاژ کرنا تھا۔ اس لیڈر نے میڈلن (نُور) کی بھی نشاندہی کر دی۔

برطانیہ اور جرمنی، دونوں کی سیکرٹ سروسیں حیران تھیں کہ نقاب اُٹھ جانے اور تنظیم ٹوٹ جانے کے باوجود نُور کا ٹرانسمٹر پیغامات نشر کرتا رہا اور وہ "تحریکِ مزاحمت" کے بکھرے ہوئے اور چھپے ہوئے افراد کو یکجا کرنے کی کوشش میں مگن رہی۔ اُس نے سوسائٹی کے اونچے درجے کے چند ایک افراد کا تعاون حاصل کر لیا۔ ان میں ایک ریڈیو بنانے والی فرم کا ڈائریکٹر تھا۔ یہ آدمی نُور کے ٹرانسمٹر کی مرمّت اور سروسنگ کرا دیا کرتا تھا۔ ایک ڈاکٹر تھا اور چند ایک اُونچے درجے کے کاروباری لوگ۔ نُور ان میں سے کسی نہ کسی کے غسلخانے کو ٹرانسمشن کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ آخر میں اُس نے اپنی جائے پناہ ایک ڈاکٹر کے گھر کو بنا لیا۔ ان تمام لوگوں نے اُسے پوری دیانتداری اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے تعاون دیا۔

نُور نے اس ڈاکٹر کا ٹیلیفون استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جرمنی کے سراغرساں ایک فون نمبر کی باتیں ٹیپ کر رہے تھے جو انہیں مشکوک معلوم ہوتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے اس گھر پر چھاپہ مارا۔ انہوں نے ایک غیر معمولی خوبصورت لڑکی کو عین اُس وقت گرفتار کر لیا جب

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اُس کا ٹرانسمٹر کھُلا پڑا تھا۔ اس گھر میں چند اور آدمی تھے اور اُن کے سامنے ایک نقشہ پڑا تھا جس پر ایک جگہ نشان لگا ہُوا تھا۔ یہ نشان زمین دوز سیورتیج کے ایک مقام پر تھا۔ اس جگہ جرمنوں نے آبدوزوں کے لیے جدید قسم کے تارپیڈو چُھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہاں سے جرمنوں نے سیورتیج (پانی گزرنے کا زمین دوز راستہ جس میں گٹروں سے پانی گرتا ہے) کا پانی روک دیا تھا۔

بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ نُور کا کمال تھا کہ اس نے تارپیڈو بموں کے اِس ذخیرے کا سراغ لگا لیا تھا۔ جس وقت جرمن سراغرسانوں نے چھاپہ مارا اُس وقت نُور لندن کو یہ پیغام دے چکی تھی کہ "مارزی پین" بارُود فلاں جگہ پہنچاؤ۔ بارُود کی یہ قسم جسے "مارزی پین" کا نام دیا گیا تھا اس لیے بہتر سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بارود والی بدبو نہیں بلکہ باداموں کے تیّل جیسی خوشبو تھی۔ اس بارود سے نُور جرمنوں کا زمین دوز تارپیڈو ذخیرہ تباہ کرنا چاہتی تھی۔

نُور کو ایک پانچ منزلہ عمارت کی سب سے اُوپر والی منزل کے ایک کمرے میں لے گئے۔ ابھی جرمنوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہی وہ مَیڈلِن ہے جسے وہ کئی مہینوں سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُس کے خلاف جُرم ثابت ہو چکا تھا۔ شہادت اور ثبوت مل گیا تھا۔ وہ جُرم کرتے پکڑی گئی تھی۔ اُسے کہا گیا کہ اُس کے ساتھیوں نے اقبالِ جُرم کر لیا ہے اور وہ بھی اقبالِ جُرم کر کے اُن تمام سوالوں کے جواب دے دے جو اُس سے پُوچھے جائیں۔ نُور اُن کے جال میں نہ آئی۔ اس کی بجائے اُس نے اس کمرے سے فرار ہونے کی بڑی ہی دلیرانہ کوشش کی۔ اُسے اُس وقت کمرے میں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ اطمینان سے سوچ لے۔ وہ سیڑھیوں کے راستے نہیں بھاگ سکتی تھی کیونکہ وہاں فوج کا پہرہ تھا۔ یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی میں سے نکل جائے گی۔

کچھ دیر بعد جرمن افسر اندر آئے تو نُور وہاں نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ کسی نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہ کھڑکی سے دُور دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی نیچے اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا سی جگہ پر اُس نے پاؤں جما رکھے تھے اور ایک جگہ ہاتھ جمائے ہوئے تھے۔ وہ اگر وہاں سے گر پڑتی تو مر جاتی مگر جرمن اُسے زندہ رکھنا چاہتے تھے ورنہ بہت سے راز اُس کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ فوجی بھی حیران تھے کہ وہ وہاں تک کس طرح پہنچ گئی ہے۔ بڑی ہی مشکل سے اُسے پکڑا گیا۔

کمرے میں لا کر اُسے نفسیاتی لحاظ سے کمزور اور بے بس کرنے کی کوشش کی گئی مگر ناکام رہے۔ پھر جسمانی اذیّتوں کا مرحلہ آیا۔ نُور نے خودکُشی کا ارادہ کیا لیکن خودکشی کے لیے لندن سے اُسے جو گولی دی گئی تھی وہ اُس کے بیگ میں رہ گئی تھی۔ یہ بیگ جرمنوں کے قبضے میں تھا۔ جرمن سراغرسانوں اور ماہرین نے یہ معلوم کر لیا کہ یہی مَیڈلِن ہے۔ انہوں نے اُس کے ساتھ نہایت اچھا سلوک شروع کر دیا۔ بہت اچھا کھانا دینے لگے۔ اُسے عزّت اور احترام سے رکھا اور اُسے کہا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جاسوسی کرے یعنی جرمنوں کی جاسوس بن جائے۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔

اذیّتیں نئے سرے سے شروع ہو گئیں۔ ایک روز اسی عمارت کے اسی کمرے میں اُس کے دو ساتھیوں کو لا کر اُس کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ جرمنوں نے ان دو آدمیوں سے اقبالِ جُرم کرا لیا تھا اور ان دونوں کو وہ اس مقصد کے لیے نُور کے پاس لے آئے کہ اُسے اقبالِ جُرم اور راز اُگلنے پر آمادہ کریں۔ جرمن باہر نکل گئے۔ نُور نے ان دو آدمیوں کا قائل ہونے کی بجائے انہیں فرار پر آمادہ کر لیا۔ تینوں کھڑکی میں سے نکل کر نیچے جانے کی بجائے دیوار کے ساتھ کہیں پاؤں اور ہاتھ جماتے چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے ساتھ والی عمارت کے چھت پر کُود گئے جس کی ایک منزل کم تھی۔ وہاں سے بھی وہ نکل گئے مگر اس عمارت کے گرد فوج

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کا اتنا پہرہ تھا کہ تینوں پکڑے گئے۔

ایک جرمن افسر ہنس کیفر (سیکرٹ سروس) نے برلن (جرمنی کے دارالحکومت) کو لکھا کہ یہ لڑکی بہت خطرناک ہے۔ اس کی حراست کا کوئی بہتر انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اُسے ایک جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے چار سال بعد (۵ اپریل ۱۹۴۹ء کے روز حکومتِ برطانیہ نے اجازت دی کہ نور عنایت خان کی کہانی سُنا دی جائے۔ اس سے پہلے اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔ جرمن افسر ہنس کیفر کو جنگ کے بعد جنگی مجرموں کے ساتھ سزائے موت دی گئی تھی۔ اُس نے مرنے سے پہلے نُور کی کہانی سُنائی تھی۔ سیکرٹ سروس کے چند اور جرمن افسروں اور کاغذات سے بھی بہت سی معلومات ملیں جن سے نُور کی داستانِ شجاعت مکمل کی گئی۔

حکومتِ برطانیہ نے ۵ اپریل ۱۹۴۹ء کے روز اپنے اخباروں کو یہ خبر دی کہ اس مسلمان عورت کو غیر معمولی بہادری اور فرض شناسی کے صلے میں برطانیہ کا دُوسرا بڑا تمغہ جو فوجیوں کے لیے ہے، دیا گیا تھا۔ اسے "جارج کراس" کہتے ہیں۔ فوجیوں کو "وکٹوریہ کراس" دیا جاتا ہے۔ اس خبر کے ساتھ اخباروں میں نُور کی مختصر سی داستان بھی شائع ہوئی۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ نُور کو "خاص طور پر خطرناک" مجرم قرار دے کر جرمنی کے ایک بڑے ہی سخت جیل خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی زنجیروں میں باندھ دیئے گئے اور پاؤں بھی۔ اُسے مرد کھانا کھلاتے اور وہی اُسے بیت الخلا میں لے جاتے اور اسے صاف کرتے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۴ء کی صبح اُسے گولی مار دی گئی۔

وہ ترکوں کے خلاف نہ لڑے

پاکستان میں ہر جگہ خصوصاً علاقہ پوٹھوہار میں، تُرکوں کا نام احترام و عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ پوٹھوہار میں ابھی تک چند بزرگ زندہ ہیں جنہوں نے پہلی جنگِ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء میں تُرکوں کو انگریزوں کے خلاف لڑتے دیکھا تھا۔ یہ بزرگ سطالوی ہند کی فوج کے سپاہی تھے اور یورپی محاذ پر لڑے تھے۔ وہ ترکوں کی شجاعت کے قصّے جھوم جھوم کر سُناتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔

پاک تُرک دوستی کا بھرپور مظاہرہ گوجہ خان (علاقہ پوٹھوہار) کے ایک جرمی سپاہی لانس دفعدار، راجہ لال خان، نے ۱۹۱۶ء میں میسوپوٹیمیا کے محاذ پر کیا تھا۔ اُس کے رسالے کو تُرکوں کے خلاف لڑنے کا حکم ملا تھا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا اور سارے کا سارا رسالہ گھوڑوں سے اُتر آیا۔ جنگِ عظیم کے اس ڈرامائی واقعہ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا نہ جنگ کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کا کہیں ہلکا سا اشارہ ہی کیا ہے، حالانکہ یہ ایک سوار کی نہیں پورے تین سَو سواروں کی داستان ہے جنہوں نے شہنشاہِ معظم برطانیہ کی حکم عدولی کی تھی اور اس کے عوض انہیں سمندر میں ڈبو دینے کی سزا دی گئی تھی۔ انگریز کی کسی کتاب میں ذکر ہو نہ ہو، پوٹھوہار کے مسلمانوں کے سینوں میں یہ داستان زندہ ہے اور زندہ ہی رہے گی۔

چند ہی برس گزرے راجہ لال خان فوت ہو گئے ہیں۔ لال خان فوت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہوتے، ان کی کہانی فوت نہیں ہوتی، فوت ہو ہی نہیں سکتی۔

پہلی جنگِ عظیم عروج پر تھی۔ تُرک میدان میں اُتر چکے تھے اور ان کے سامنے انگریزوں کے قدم اُکھڑ رہے تھے۔ تُرکوں نے سنگین زنی کے وہ مظاہرے کئے جسے ایک دُنیا نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ راتفلوں کے ساتھ لگی ہوئی سولہ انچ لمبی سنگینیں گورے سپاہیوں کے پیٹ میں مار کر انہیں اُوپر اُٹھا کر پیچھے پھینکتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ تُرک سپاہی مورچوں سے فائر کرنے سے دست بدست جھڑپ کو زیادہ پسند کرتے تھے اور وہ مسلسل کئی کئی روز ان جھڑپوں میں سنگین زنی کرتے تھے اور تھکان سے شل ہو جایا کرتے تھے۔

انگریز کے پاس کٹوانے کے لئے غلام ہندوستان کی فوج تھی۔ اس فوج میں ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ مسلمان بھی تھے۔ انہیں بھی جرمنوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ انگریزوں کو توقع تھی کہ تُرکوں کی مختصر سی سپاہ کو برطانوی سپاہی بڑی آسانی سے سنبھال لیں گے، لیکن تُرکوں نے انگریز کے خوابوں کو بالکل اسی طرح سنگینوں سے لہولہان کر دیا جس طرح ستمبر کی جنگ میں پاکستانی غازیوں نے ہندوستانی سپنے اس کی دھرتی میں ریزہ ریزہ کئے تھے۔ پیش قدمی تو دُور کی بات تھی، انگریز کے لئے ٹِک کر دفاعی جنگ لڑنا بھی محال ہو گیا تھا۔

ہندوستانی فوج ابھی جرمنوں کے خلاف استعمال کی جا رہی تھی اور عربی محاذ پر جرمن پسپا ہو رہے تھے۔ انگریزوں کا پلّہ بھاری تھا اس محاذ پر علاقہ پوٹھوہار کا رسالہ بھی لڑ رہا تھا "جو گھوڑوں کا رسالہ" کہلاتا تھا لیکن اس کا نام کور آف گائیڈز کیولری تھا۔ اس کے سب سوار (تین ساڑھے تین سَو) مسلمان تھے اور تحصیل گوجر خان کے رہنے والے۔ انگریزوں نے اِس رسالے کو جرمنوں کے محاذ سے ہٹا کر میسوپوٹیمیا (عراق) کے محاذ پر تُرکوں کے خلاف بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

جب اِن مسلمان سواروں کو تُرکوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا جانے

لگا تو رسالے کے انگریز کمانڈر نے غالباً یہ سوچا کہ مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑانا آسان نہیں، چنانچہ اُس نے تقریر شروع کر دی۔ پورا رسالہ اُس کے سامنے باقاعدہ صفوں میں گھوڑوں پر سوار کھڑا تھا۔ کمانڈر نے پہلے تو تُرکوں کے خلاف زہر اُگلا پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تُرک مسلمان ہی نہیں ہیں اور کہا ــــ "ہم ایسے دُشمن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے ... جوانو! تُرک تم سے زیادہ بہادر نہیں۔ تم انہیں ایک دن میں بھگا دو گے جس طرح تم نے جرمنوں کو بھگایا ہے۔ اب کُوچ کی تیاری کرو۔"

تمام رسالے پر خاموشی طاری تھی۔ کوئی گھوڑا بھی ہلکے سے کھُر نہیں مار رہا تھا۔ جب کمانڈر نے رسالے کو کُوچ کی تیاری کے لئے "ڈِسمس" ہونے کا حکم دیا تو بھی رسالے پر خاموشی طاری رہی اور کوئی سوار "ڈسمس" نہ ہُوا۔ گھوڑے جہاں کھڑے تھے کھڑے رہے۔ کمانڈر نے اب کے کمانڈروں کی طرح "ڈِسمس" کا آرڈر دیا۔ سواروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اتنے میں پچھلی صف سے ایک سوار نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا، ہلکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑا دُلکی چال چلتا کمانڈر کے سامنے جا رُکا۔ سوار نے زین کے ساتھ بندھی ہوئی راتفل کھولی، گھوڑے سے اُترا، اپنا نیزہ، کرچ (تلوار) اور راتفل کمانڈر کے گھوڑے کے سامنے پھینک کر سیلوٹ کیا۔

"حضور!" ــــ سوار نے اپنے کمانڈر سے کہا ــــ "کسی اور محاذ پہ بھیج دیں، ہم پہلے کی طرح جانیں لڑا دیں گے لیکن مسلمان ہوتے ہُوئے مسلمان بھائی کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ تُرک مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی۔"

اس سوار کا نام راجہ لال خان تھا۔

پیشتر اس کے کہ کمانڈر کچھ کہتا سارے کے سارے سوار گھوڑوں سے اُتر آئے اور راتفلیں، نیزے اور کرچیں کمانڈر کے گھوڑے کے آگے ڈھیر کر دیں اور الگ جا کھڑے ہُوئے۔ گھوڑے، سواروں کے بغیر، الگ کھڑے تھے۔ کمانڈر اور رسالے کے سکواڈرن کمانڈر بہت چیخے۔ گولی سے مار دینے کی دھمکیاں دیں لیکن مسلمان سوار چُپ چاپ کھڑے رہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جنگ میں اس قدر سنگین حکم عدولی کی سزا موت ہوتی ہے۔ ساڑھے تین سو مسلمان سواروں کو سزائے موت دینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن انگریز کو پتہ تھا کہ یہ خبر پھیل گئی تو پنجاب اور خصوصاً پوٹھوہار کے علاقے سے آئندہ برطانوی فوج کو کوئی سپاہی نہیں ملے گا۔

انگریز کے لئے مشکل اندر مشکل تھی۔ وہ ان سرکش مسلمانوں کو نہ معاف کر سکتا تھا نہ ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

رسالہ نہتہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اسے پچھلے کیمپ میں کھلی نظر بندی میں رکھ کر اس پر گوروں کی ایک مسلح کمپنی کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ سوار اجتماعی کورٹ مارشل کا انتظار کرنے لگے۔ سب کو یقین تھا کہ انہیں سزائے موت دی جائے گی، لیکن چند دنوں بعد یہ خلاف توقع اور حیران کن حکم آیا کہ تمام سواروں کو وطن واپس لے جا کر ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔

دوسرے ہی دن ان مسلمان سواروں کو ایک بندرگاہ پر لے جا کر ایک بوسیدہ سے بحری جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ایک دقیانوسی قسم کا بہت ہی پرانا اور ٹوٹا پھوٹا جہاز تھا۔ اس پر عملہ بھی ضرورت سے کم تھا۔ چنانچہ مسلمان سواروں کو اپنی سلامتی خطرے میں محسوس ہوتی۔ وہ جہاز سے اتر آئے۔ انہوں نے کہا کہ راستے میں خطرہ ہے کیونکہ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ لہٰذا یا تو ہمیں رائفلیں دے کر بھیجا جائے یا ہمارے ساتھ رائفلوں سے مسلح ایک کمپنی بھیجی جائے۔ انگریزوں نے بہت پس و پیش کی لیکن مسلمان کسی گہری سازش کے خطرے سے چوکنے ہو گئے تھے اور وہ بندرگاہ پر ڈٹے رہے۔ آخر بڑی دقت سے ان کے ساتھ گورا رجمنٹ کی ایک آدھی مسلح کمپنی بھیج دی گئی۔

رات کے وقت جہاز بندرگاہ سے نکلا اور سات آٹھ روز کے بحری سفر کے بعد ایک جگہ رک گیا۔ سواروں نے دیکھا کہ دور دور تک ساحل کا نشان نہ تھا اور ہر طرف گہرا نیلا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ دنیا کا کونسا حصہ ہے اور جہاز کیوں رک گیا ہے۔ دو تین

دن گزر گئے اور جہاز رکا رہا۔ سواروں نے دیکھا کہ ان کے "محافظ" گورے اور جہاز ران بڑی بے چینی سے عرشے پر جا جا کر چاروں طرف سمندر کی وسعت کو متجسس نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سواروں کو شک سا ہوا اور انہوں نے کسی ان جانے خطرے کے پیش نظر اپنے پہرہ دار مقرر کر دیئے جو رات بھر باری باری جاگتے تھے اور گوروں کی حرکات و سکنات دیکھتے رہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔

آٹھ روز گزر گئے تو جہاز کے عملے اور حفاظتی دستے میں بے چینی بڑھ گئی۔ اب تو ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت سے غصہ اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور جہاز میں راشن بھی ختم ہو رہا تھا۔ آخر سواروں نے جہاز رانوں اور حفاظتی دستے کے کمانڈر سے احتجاج کیا اور سختی سے پوچھا کہ جہاز کیوں رکا ہوا ہے۔ جب انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو سواروں نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ وہ نہتے ہونے کے باوجود گوروں کو ختم کر دیں گے۔ مٹھی بھر حفاظتی دستہ جو پہلے ہی بے چین تھا اب گھبرانے بھی لگا۔

آخر جہاز نے لنگر اٹھا دیئے اور چند روز بعد وہ بمبئی کی بندرگاہ میں آ لگا۔ تھوڑے دنوں کی نظر بندی کے بعد ان تمام سواروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ (اس سزا کو فوج کی دیہاتی زبان میں "بارہ پتھر" کر دینا کہتے ہیں)۔

پھر جنگ ختم ہو گئی اور بات نکلتے نکلتے نکل گئی۔ ان تین ساڑھے تین سو سواروں کے متعلق حکم آیا تھا کہ انہیں کسی پرانے سے بحری جہاز پر بٹھا کر کہا جائے کہ انہیں وطن واپس بھیجا جا رہا ہے اور کھلے سمندر میں لے جا کر پیچھے سے ایک جنگی جہاز بھیج دیا جائے جو توپوں سے اس جہاز کو سواروں سمیت غرق کر دے۔ اس کے لئے حفاظتی دستے اور جہاز رانوں کے عملے کو غرقابی سے پہلے نکالنا ضروری تھا۔ چنانچہ جہاز پہلے سے طے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کئے ہُوئے مقام پر جا کے رُکا رہا، لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ حفاظتی دستے اور جہاز رانوں کو کوئی جہاز سے نکالنے نہ آیا۔ کوئی جنگی جہاز بھی نہ پہنچ سکا اور سواروں کا جہاز بہتی آ گیا۔

اِس واقعہ کا ذِکر کسی کتاب میں نہیں لیکن اس کا ثبوت ایسے ہی ایک واقعہ سے ملتا ہے جس کا تفصیلی ذکر ایک انگریز فوجی افسر کیپٹن فریڈی گیسٹ نے اپنی کتاب "انڈین کیولری مین" INDIAN CAVALRYMAN میں کیا ہے۔ مصنف پہلی جنگِ عظیم کے دوران ایک ہندوستانی رسالے کا افسر بن کے آیا تھا اور وہ دوسری جنگِ عظیم (۴۵ - ۱۹۳۹ء) تک برصغیر میں رہا۔ اس کی یہ کتاب اسی دَور کا ایک رپورتاژ ہے جو تعصب اور جانبداری سے بھرپور ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں لندن میں چھپی تھی۔

فریڈی گیسٹ نے راجہ لال خان مرحوم کے واقعہ جیسا ایک واقعہ لکھا ہے جو زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ اس سے بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا واقعہ من وعن صحیح ہے۔

فریڈی گیسٹ لکھتا ہے ـــــ "۱۹۱۶ء کے آخر میں میسوپوٹیمیا کے محاذ پر برطانوی افواج کی کیفیت تسلی بخش نہیں تھی۔ تُرک ہمارے خلاف میدان میں آ گئے تھے اور ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارا رسالہ جھانسی میں مقیم تھا۔ اچانک حکم آ گیا کہ رسالہ میسوپوٹیمیا کے لئے فوراً روانہ ہو جائے۔ وہاں پہلے ایک ہندوستانی رسالہ موجود تھا جسے معلوم نہیں کیوں واپس ہندوستان بھیجا جا رہا تھا۔ ہمارے رسالے میں ہندو سکواڈرنوں کے ساتھ دو سکواڈرن مسلمانوں کے تھے۔ یہ خبر تو تمام دُنیا میں پھیل گئی تھی کہ تُرک برطانیہ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں تُرکوں کا خاص احترام تھا کیونکہ تُرک مسلمان تھے۔ مسجدوں میں ہماری حکومت کے خلاف وعظ ہونے لگے اور تُرکوں کی فتح کے لئے دعائیں مانگی جانے لگیں ....

"ہمارے کمانڈر نے رسالے کو پریڈ پر بلا کر میسوپوٹیمیا کے لئے

روانگی کا حکم سُنایا اور اُس نے غلطی سے یہ بھی کہہ دیا کہ رسالہ تُرکوں کے خلاف لڑنے کے لئے جا رہا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مسلمان سواروں کے چہروں پر نمایاں تبدیلی آ گئی۔ کمانڈر بھی سمجھ گیا کہ اُس کے حکم کی راہ میں مذہب حائل ہو گیا ہے۔ اُس نے پریڈ برخاست کر دی لیکن مسلمان سواروں کو وہیں روک لیا اور انہیں کہا ـــــ "ہمیں معلوم ہے کہ انڈیا میں مذہبی تعصب بڑھ رہا ہے اور غلط قسم کے مذہبی جذبات کو ہوا دی جا رہی ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مسلمان سوار مذہب کے نام پر گمراہ نہیں ہوں گے اور شہنشاہِ معظم کا حکم خندہ پیشانی سے بجا لائیں گے"....

"کمانڈر نے دیکھا کہ مسلمانوں پر انوکھی سی خاموشی طاری تھی اور ان کے چہروں پر جو تبدیلی آ گئی تھی وہ بھی انوکھی تھی۔ کمانڈر عتاب میں آ گیا اور بولا ـــــ "جو سوار تُرکوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتا ایک قدم آگے آ جائے" ـــــ تمام مسلمان سوار ایک قدم آگے آ گئے....

"ہمارا کمانڈر غصّے میں آ کر عظیم لغزش کر بیٹھا۔ اُس نے قہر آلود اور پُرنفرت لہجے میں کہا ـــــ "تم مسلمان سوار بُزدل ہو۔ مذہب کی آڑ لے کر جنگ سے بھاگنا چاہتے ہو"

کیپٹن فریڈی گیسٹ حالانکہ تحریر میں متعصب ہے لیکن لکھتا ہے ـــــ "مسلمان سپاہی بُزدلی کے الزام کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جو انگریز افسر مسلمان سپاہیوں کے ساتھ کچھ عرصہ رہے ہیں وہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان سپاہی نے کبھی بُزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دنیا کے بلا مبالغہ تمام ملکوں کے سپاہیوں میں جنگ کے لئے ہر لمحہ تیار برتیار رہنے والے صرف مسلمان ہیں۔ ان میں پنجابی اور پٹھان خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے کمانڈر کا الزام بے بنیاد تھا"

فریڈی گیسٹ نے لکھا ہے ـــــ "کمانڈر کو جوانوں کی خاموشی سے تسلی ہو گئی کہ وہ مرعوب ہو گئے ہیں اور اب انہیں حکم عدولی کی جرأت نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہوگی۔ اُس نے انہیں برخواست کر دیا اور مسلمان سوار نہایت خاموشی سے بارکوں میں چلے گئے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ بھانپ سکا کہ ان کی یہ خاموشی کتنے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے ....

"... اگلے ہی روز مسلمان سوار اصطبل میں اپنے گھوڑوں سے ذرا پرے روز مرّہ کی پریڈ کے لئے کھڑے تھے۔ دونوں سکواڈرنوں کے رسالدار بھی مسلمان تھے۔ وہ دونو غائب تھے۔ اُن کا پریڈ پہ موجود ہونا ضروری تھا۔ کمانڈر نے رسالداروں کو غائب پاکر غصّے میں حکم دیا — 'اپنے اپنے گھوڑوں کے پاس کھڑے ہو جاؤ' — لیکن کوئی سوار اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کمانڈر نے اپنا حکم دُہرایا تو بھی کوئی جوان نہ ہلا۔ کمانڈر نے غصّے میں آکر گالی دے دی۔ معاً اصطبل کے کسی گوشے سے دو مسلمان سوار نمودار ہوتے۔ اُن کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہوں نے بیک وقت نشانہ باندھ کر کمانڈر پر گولیاں چلا دیں اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا ....

"... قریب ہی ایک انگریز لیفٹیننٹ کھڑا تھا۔ اُس نے جست لگا کر ایک مسلّح سوار کو دبوچ لیا لیکن ایک اور سوار نے رائفل کا بٹ لیفٹیننٹ کے سر پر ایسا مارا کہ وہ گرا اور مر گیا .... میں آج بھی حیران ہوں کہ وہ لوگ رائفلیں کہاں سے لے آئے تھے کیونکہ رائفلیں کوٹوں میں بند تھیں اور پریڈ پر رائفلوں کی ضرورت نہیں تھی ....

"ہندو افسروں کو بلایا گیا۔ وہ مسلمانوں سے ہتھیار رکھوانے کے لئے چند ایک ہندو سواروں کو لے آئے لیکن مسلمان سواروں نے دونوں ہندو افسروں کو بھی جان سے مار دیا۔ اُس وقت پتہ چلا کہ صرف دو ہی نہیں کئی مسلمان سوار رائفلوں سے مسلّح تھے اور وہ جانے کس طرح میگزین سے ایمونیشن بھی نکال لاتے تھے۔ وہ بے قابو ہو کر چھاؤنی کے علاقے میں چلے گئے۔ راستے میں انہوں نے ایک اور انگریز افسر کو گولی مار دی ....

"... ان میں سے چار سوار (جو اُس وقت پیادہ تھے) رسالے کے کمانڈنگ آفیسر (کرنل) کے بنگلے پہ جا پہنچے اور اُسے للکار کر باہر بلایا جب

وہ باہر آیا تو چاروں سواروں نے اُس پر رائفلوں سے نشانے باندھ لئے، لیکن کرنل بھانپ گیا کہ کوئی شدید قسم کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس نے بڑے تحمل سے کہا — 'مجھے مارنے سے پہلے سوچ لو کہ میں مر گیا تو تمہاری شکایت سُننے والا کوئی نہ رہے گا۔ پہلے اپنی شکایت بتاؤ'...

"انہوں نے رائفلیں نیچے کر لیں اور ایک بولا — 'ہم ترکوں کے خلاف نہیں لڑیں گے' — دوسرے نے کہا — 'ترک ہمارے بھائی ہیں' — تیسرے نے کہا — 'ہم بُزدل نہیں ہیں۔ کمانڈر نے ہمیں بُزدل کہا ہے' — کرنل نے کہا — 'بس اب تم بارکوں میں چلے جاؤ اور صبر سے کام لو' — لیکن چوتھے سوار نے رائفل تان کر کہا — 'یہ انگریز ہے، اس کی زبان پر اعتبار نہ کرو'...

"... اور جب وہ نشانہ باندھ کر گولی چلانے لگا تو کرنل کا اردلی جو اتفاق سے مسلمان تھا کرنل کے سامنے آگیا۔ اُدھر گولی نکل چکی تھی جو اردلی کو ختم کر گئی اور کرنل بچ گیا .... مسلمان سواروں کو شاید صدمہ ہُوا ہو گا کہ اُن کا اپنا بھائی اُن کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ اُدھر باقی مسلمان سواروں نے چھاؤنی میں ہر اس پھیلا رکھا تھا۔ یہ ایک مسلّح بغاوت تھی جسے دبانے کے لئے برطانوی مشین گن بٹالین کو بُلا لیا گیا۔"

فریڈی گیسٹ آخر میں لکھتا ہے — "جب چاروں سوار کرنل کے بنگلے سے نکلے تو کرنل نے تلوار نکال لی اور گھوڑے پر بیٹھ کر ان چاروں کا تعاقب کیا۔ چاروں بھاگ اُٹھے۔ ایک کو اُس نے تلوار سے ہلاک کیا، ایک کو گھوڑے تلے روندا اور باقی دو گلیوں میں غائب ہو گئے .... دوسرے روز مرے ہوئے دونوں باغیوں کی لاشوں کو تمام رسالے کے سامنے آگ لگا دی گئی اور یہ منظر مسلمان سواروں نے بھی دیکھا۔"

صاف پتہ چلتا ہے کہ برطانوی کیپٹن نے یہ آخری پیرا محض خفّت مٹانے کے لئے لکھا ہے۔ جن مسلمان سپاہیوں کے متعلق فریڈی گیسٹ نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ "مسلمان سپاہی بُزدل نہیں ہوتا" بھلا وہ سپاہی مسلّح

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanpoint

ہو کر ایک آدمی کے آگے آگے بھاگ اُٹھے ہوں گے جو صرف ایک تلوار سے مسلح تھا! پھر جو مسلمان سپاہی تُرکوں کے خلاف لڑنے پر اس قدر آگ بگولہ ہو گئے تھے وہ اپنے بھائیوں کی لاشوں کو جلتا چُپ کر کے دیکھتے رہے ہوں گے! اگر دو لاشوں کو جلانے تک کی غیر قانونی اور فوجی قوانین کے خلاف حرکت کی گئی تو باقی 'باغیوں' کو کیوں بخش دیا گیا؟

سینہ بہ سینہ آتی ہوتی باتوں اور فریڈی گیسٹ کے اس تفصیلی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے کو راجہ لال خان مرحوم کے رسالے کی جگہ بھیجا جا رہا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد اس رسالے کو بھی میسوپوٹیمیا نہ بھیجا گیا اور انگریزی حکومت کو تادیبی کارروائی کی بھی جرأت نہ ہوتی کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا کیا حشر ہو گا۔

فریڈی گیسٹ کی ایک بات البتہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے ——

"اس ساری افسوسناک واردات کے دوران ہندو سوار بہت وفادار رہے اور انہوں نے مسلمانوں کی بغاوت کو دبانے میں بہت کام کیا۔"

پرچم اُڑتا رہا

یکم جنوری ۱۹۱۵ء کے روز ایک ایسی فوج نے آسٹریلیا کے خلاف جنگ شروع کر دی جس میں صرف دو آدمی تھے۔ اُن کا جنگی سامان صرف اتنا سا تھا۔ دو زنگ آلود رائفلیں اور تقریباً ڈیڑھ سو راؤنڈ — اُن کی ٹرانسپورٹ آئس کریم والی ریڑھی تھی جس کے آگے ایک بُوڑھا گھوڑا جُتا ہُوا تھا۔ دو آدمیوں کی اس فوج کا پرچم ایک میز پوش تھا جسے لال رنگ میں رنگ کر اس پر انہوں نے اپنے ہاتھوں چاند ستارہ بنایا تھا — یہ تُرکی کا جھنڈا تھا

آسٹریلیا کے جنوب میں نیو ساؤتھ ویلز کے چھوٹے سے قصبے بروکن ہل کے لوگ اپنے ساتھ رہنے والے دو مسلمانوں —— گل محمد اور مُلا عبداللہ —— کو افغان سمجھتے تھے کیونکہ اُن دنوں آسٹریلیا کے اس ریگستانی علاقے میں سینکڑوں افغان شتربان تھے۔ انہیں وہاں انگریز لے گئے تھے بعد میں انکشاف ہُوا کہ گل محمد اور مُلا عبداللہ تُرک ہیں اور جذبۂ حُب الوطنی میں کٹّر بلکہ جنونی وطن پرست ہیں۔

تُرکی ۱۹۱۴ء میں ہی انگریزوں اور اُن کے اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو گیا تھا لیکن سفید ریش، ساٹھ سالہ گل محمد کو آسٹریلیا میں ۱۹۱۴ء کے آخری روز پتہ چلا کہ تُرکی نے انگریزوں کے خلاف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔ آسٹریلیا انگریزوں کی بادشاہی کا ملک تھا۔ گل محمد جوشِ جہاد اور ہیجان سے کانپتا ہُوا اپنے ترک ساتھی مُلّا عبداللہ کے ہاں دوڑا گیا۔ مُلّا عبداللہ جواں سال آدمی تھا اور بروکن ہل میں قصاب تھا۔ وہاں یہی دو تُرک تھے۔ گل محمد نے مُلّا عبداللہ کو بتایا کہ اعلانِ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ تُرک جہاں کہیں بھی ہیں وہ انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ آسٹریلیا چونکہ انگریزوں کی مملکت تھی اس لیے اِن دونوں تُرکوں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں آسٹریلیا کے خلاف فوراً جنگ شروع کر دینی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے وہ صدیوں پُرانی رائفلیں نکالیں جو انہوں نے کبھی شوقیہ خریدی تھیں۔ اُن کے پاس چمڑے کی تین پیٹیاں (بیلٹیں) تھیں۔ ہر ایک میں ایک سو راؤنڈ آ سکتے تھے۔ انہوں نے تینوں بیلٹوں میں ڈیڑھ سو راؤنڈ اُڑس لیے۔

میدانِ جنگ میں قومی پرچم کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ایک میز پوش رنگ لیا اور اس پر چاند ستارہ بنا لیا۔ اس کے ایک طرف بانس ڈال دیا۔ پرچم تیار ہو گیا۔ گل محمد آئس کریم بیچا کرتا تھا۔ اس کے لیے اُس نے ایک ریڑھی بنا رکھی تھی جس کے آگے وہ گھوڑا جوت کر سارے قصبے میں گھوم پھر کے آئس کریم بیچتا تھا۔ انہوں نے اسلحہ بارُود ریڑھی میں رکھ لیا۔ اب وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔

انہوں نے میدانِ جنگ کا انتخاب کر لیا۔ یہ جگہ قصبے سے دو میل دُور کے گول اور گنبد نما ٹیلوں کے علاقے میں تھی۔ وہ اُس جگہ چلے گئے اور مورچہ تیار کر لیا۔ قریب سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ گل محمد اور مُلّا عبداللہ دشمن کا انتظار کرنے لگے — کوئی نصف گھنٹہ بعد دشمن آ گیا۔ یہ ایک مسافر گاڑی تھی جس میں زیادہ تر قصبے کے لوگ کنبوں سمیت سوار تھے۔ چونکہ وہ نئے سال کا پہلا دن تھا، اس لیے لوگ اجتماعی پکنک کے لیے جا رہے تھے۔ ان میں اکثریت کان کنوں اور ان کے بیوی بچوں کی تھی۔ وہ ہنستے اور گاتے ہوئے جا رہے تھے۔

بعض بچوں نے گاڑی کی کھڑکیوں میں سے آئس کریم کی ریڑھی دیکھ لی۔ یہ اُن کی محبوب ریڑھی تھی۔ وہ تالیاں بجانے لگے۔ دونوں تُرکوں نے فائر کھول دیا۔ پہلی دو گولیوں سے دو بچے مارے گئے۔ دُوسری دو گولیوں سے ایک مرد اور ایک عورت کا خاتمہ ہو گیا۔ گولیوں سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے ٹکڑوں نے کئی مسافروں کو زخمی کر دیا۔ مسافروں نے چیخ و پکار کی۔ کسی نے زنجیر کھینچی اور گاڑی رُک گئی۔ مسافر کھلبلی کی حالت میں گاڑی سے اُترنے لگے۔

ریلوے لائن کے قریب لوہے کے ایک بکس میں ریلوے والوں کے استعمال کے لیے ٹیلیفون لگا ہُوا تھا۔ انجن کے فائرمین نے یہ بکس کھولا اور پولیس سٹیشن کو اطلاع دی کہ گاڑی پر فائرنگ ہو رہی ہے اور کئی مسافر ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ پولیس انسپکٹر ایڈورڈ ٹلر نے یہ پیغام سُنا تو وہ سمجھا کہ فون کرنے والا ریلوے کا کوئی آدمی ہے جو بہت زیادہ شراب پی گیا ہے مگر فائرمین نے اُسے کہا کہ جہاں سے فائر آ رہا ہے وہاں ایک جھنڈا لہرا رہا ہے جس پر چاند اور ستارہ ہے اور وہاں آئس کریم کی گھوڑا ریڑھی بھی کھڑی ہے۔ انسپکٹر ایڈورڈ ٹلر اس ریڑھی سے واقف تھا۔ وہ اس کے مالک گل محمد کو جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آسٹریلیا میں بھی جنگِ عظیم شروع ہو چکی ہے۔

انسپکٹر ایڈورڈ ٹلر اُچھل کے اُٹھا اور قریب کے فوجی کیمپ میں جا کر بتایا کہ قصبے سے دو میل دُور کیا ہو رہا ہے۔ اُسے اسی فوجی دیئے گئے۔ اس فورس میں اُس نے اپنے بہت سے کانسٹیبل شامل کر دیئے۔ فوج اور پولیس کی اس نفری کو فوراً میدانِ جنگ میں پہنچایا گیا مگر تُرک وہ پوزیشن چھوڑ کر کچھ دُور چٹانوں میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے اپنا پرچم ایک اونچی چٹان پر لگا دیا اور مورچہ بند ہو گئے۔ انہیں یقیناً احساس ہو گا کہ پولیس یا فوج آئے گی اور اُن کی اصل جنگ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

انہی کے ساتھ ہو گی۔ اس کے لیے انہوں نے چٹانی پوزیشن بہتر سمجھی۔

فوج اور پولیس کے سپاہیوں نے چاند ستارے کا پرچم دیکھا اور وہاں ہلّہ بول دیا مگر اُن کی خوش فہمی ترکوں کے فائر نے رفع کر دی۔

وہ نہایت کارگر فائر کر رہے تھے۔ ہلّہ بولنے والے رُک گئے اور اِدھر اُدھر پھیل کر چٹانوں کی اوٹ میں جُھکے ہوئے یا رینگتے ہوتے آگے بڑھنے لگے۔ دونوں ترکوں نے کئی سپاہی اوندھے کر دیئے۔ ہلّہ بولنے والے گالیاں دیتے اور کوستے ہوئے پیچھے ہٹ آئے۔

جب سامنے کا یہ حملہ ناکام رہا تو انسپکٹر ایڈورڈ ملز نے پہلوؤں سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود ایک کانسٹیبل کو جس کا نام جیک ملز تھا، ساتھ لے کر ترکوں کے عقب سے آگے بڑھا۔ دونوں دبے پاؤں بڑھتے گئے۔ فاصلہ دو سو گز رہ گیا تو ترکوں نے انہیں دیکھ لیا۔ ترکوں نے تین گولیاں فائر کیں۔ ایک گولی کانسٹیبل جیک ملز کے پیٹ میں لگی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گرا اور تڑپنے لگا۔ دوسری گولی انسپکٹر ایڈورڈ ملز کی ران میں سے گزر گئی اور اُس کی چیخیں نکلنے لگیں۔ دونوں زخمی بڑی مشکل سے رینگتے ہوتے پیچھے آ گئے۔

ریل گاڑی آگے جانے کی بجائے واپس بروکن ہل چلی گئی۔ سارے قصبے میں خبر پھیل گئی کہ گل محمد اور مُلّا عبداللہ نے ریل گاڑی پر فائرنگ کی ہے۔ کوئی بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ دو بھلے مانس مسلمان "افغان" ایسی خوفناک حرکت کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کی بیویاں مُلّا عبداللہ قصاب سے گوشت لاتی ہیں اور ہمارے بچے گل محمد کی آئس کریم کے شیدائی ہیں۔ دونوں غیر ملکی اور غیر مذہب کے آدمی قصبے کے ہر گھر کے فرد معلوم ہوتے تھے مگر جب ریل گاڑی سے اُتاری ہوئی لاشیں قصبے کے لوگوں نے دیکھیں تو سب غصّے اور انتقام سے بھڑک اُٹھے۔ ہر وہ آدمی جس کے پاس رائفل تھی یا پستول تھا، مسلح ہو کر میدانِ جنگ کی طرف دوڑ پڑا۔

تھوڑی سی دیر میں ایک سو شہری جو رائفلوں اور پستولوں سے مسلح تھے اُس محاصرے میں شامل ہو گئے جو فوج اور پولیس نے دو ترکوں کے مورچے کا کر رکھا تھا۔ شہری دانت پیس پیس کر کہتے تھے کہ گل محمد اور مُلّا عبداللہ انہیں زندہ مِل گئے تو وہ ان کا قیمہ کر دیں گے مگر کسی کا قیمہ کرنے سے پہلے اُسے پکڑنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں یہی مسئلہ تھا۔ دو سو سے کچھ زیادہ رائفلیں ترکوں کے مورچے پر چاروں طرف سے مسلسل فائر کر رہی تھیں۔ جونہی کسی کا سر چٹان سے ذرا اُوپر ہو جاتا ترکوں کی گولی آتی اور وہ سر فوراً غائب ہو جاتا یا لڑھک جاتا۔

اب ترک دیکھ کر اور تاک کر گولی چلاتے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنی نفری کے محاصرے میں ہیں۔ انہوں نے بلند آواز سے جنگی ترانے گانے شروع کر دیئے۔ پھر وہ قرآن کی آیات پڑھنے لگے۔ اُن کی آواز اتنی بلند تھی کہ ریگستان میں دُور دُور تک سنائی دیتی تھی۔ وہ نعرے بھی لگاتے تھے۔ اُن کے سروں پر چاند ستارے والا پرچم پھڑ پھڑا رہا تھا۔

مہینہ تو جنوری کا تھا لیکن دنیا کے اس خطّے میں دن گرم ہو جاتے تھے۔ وہ ریگستان تھا۔ محاصرہ کرنے والوں نے ترکوں کی آواز کی تبدیلی سے اندازہ کیا کہ وہ پیاسے ہیں اور ان کے پاس پانی نہیں۔ وہ چونکہ بلند آواز سے ترانے گاتے اور آیات پڑھتے تھے اس لیے سب سُن رہے تھے۔ پہلے اُن کی آواز میں تازگی تھی جو سورج کی گرمی بڑھنے کے بعد ختم ہو گئی۔ اب اُن کی آوازیں پھٹی پھٹی تھیں مگر ان کی رائفلوں کی نالیاں تر و تازہ تھیں۔ اُن کی اگلی ہوئی گولیاں ضائع نہیں جاتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی آدمی ہلاک یا زخمی ضرور ہوتا تھا۔

ترکوں کے پرچم میں اتنی گولیاں لگی تھیں کہ اس کے چیتھڑے لٹک آئے تھے مگر چاند ستارہ محفوظ تھا اور ہوا میں لہرا رہا تھا۔ پرچم کا بانس محفوظ تھا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صرف دو آدمیوں سے ہتھیار ڈلوانے اور انہیں پکڑنے کے لیے مزید کمک آگئی۔ یہ فوج نے بھیجی تھی۔ مسلح شہریوں میں بھی اضافہ ہوگیا اور اب حملے کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ پچاس بہترین نشانہ بازوں کو نیم دائرے میں پھیلا کر انہیں کہا گیا کہ وہ ترکوں کے مورچے پر مسلسل فائر کرتے رہیں تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ ایک سو آدمیوں کو حکم ملا کہ وہ پچاس رائفلوں کے کورنگ فائر کے نیچے رینگ کر ترکوں کے مورچے تک مختلف اطراف سے پہنچیں اور اُن پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ آپریشن شروع ہوگیا۔ گل محمد اور مُلّا عبداللہ کے مورچے کے اردگرد چٹانوں پر گولیوں کا مینہ برسنے لگا۔ چٹانوں کے ریزے اردگرد اُڑنے لگے۔ اس فائر کے نیچے ایک سو آدمی بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ ترکوں کے نعرے، ترانے اور آیات خاموش ہوگئیں اور اُن کے فائر میں کمی بھی آنے لگی۔

آخر ایک سو آدمی دو آدمیوں کے مورچے پر جا پڑے۔ وہاں صرف مُلّا عبداللہ زندہ تھا۔ گل محمد مر چکا تھا۔ پتہ چلا کہ اُسے چھ گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی اُس کے کندھے میں لگی تھی۔ یہ بازو بیکار ہو جانے کے بعد وہ ایک ہاتھ سے رائفل فائر کرتا رہا تھا۔

مُلّا عبداللہ کچھ دیر تک فائر نہیں کر سکا تھا کیونکہ ایک گولی نے اُس کے گال کی ہڈی توڑ دی تھی اور ایک گولی اُس کی کھوپڑی کی ہڈی کو اُوپر سے کاٹتی گزر گئی تھی۔ دماغ محفوظ رہا اور ہڈی زیادہ نہ ٹوٹی۔ اُس کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اب وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسے سٹریچر پر ڈال کر چٹانوں سے باہر لایا گیا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے۔ خطرہ تھا کہ وہ مُلّا عبداللہ کی بوٹیاں نوچ لیں گے لیکن انہوں نے اُسے دیکھا اور پیچھے ہٹ گئے۔

وہ صرف پیچھے ہی نہ ہٹے بلکہ کئی آوازیں سنائی دیں بہت

سے لوگ ان دونوں ترکوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنے ملک کی آن کی خاطر ایک پوری قوم سے ٹکر لی اور اپنے پرچم کی خاطر جانیں دے دیں۔ لوگ ایک دوسرے کو ان کی مثال دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ حُبّ الوطنی کا جذبہ ہو تو ایسا ہو۔

مُلّا عبداللہ نے ہسپتال میں لیٹے لیٹے سر اٹھایا اور گال کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باوجود جاندار آواز میں کہا۔ "ہم دونوں کو خوشی تھی کہ ہم اپنے ملک کے لیے لڑ رہے تھے اور ہم زیادہ خوش ہیں کہ اپنے ملک کے لیے مر رہے ہیں"۔ یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ وہ دو تین منٹ بعد خدائے حقیقی کے حضور پہنچ گیا۔

اُن کی رائفلیں، تینوں خالی بیلٹیں، آئس کریم والی ریڑھی کا ایک پہیہ اور اُن کا تار تار پرچم آج بھی نیوساؤتھ ویلز کے پولیس کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تُرکوں کی قید سے میرا فرار

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے، تُرکی کی فوج کا کمانڈر انچیف جنرل کاشقن پاکستان آیا۔ اُس وقت امریکہ کی قیادت میں برطانیہ، پاکستان، ترکی، ایران اور عراق کو ایک دفاعی اور ترقیاتی معاہدے میں لانے کی بات چیت ہو رہی تھی جو بعد میں بغداد پیکٹ اور چار سال بعد سینٹو (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کے نام سے وجود میں آیا۔ میں اُس وقت میجر جنرل تھا اور ریٹائر ہونے والا تھا۔ آرمی سروس کور" نے مجھے کرنل کمانڈنٹ" کا اعزاز دے رکھا تھا۔ یہ اعزاز متعلقہ محکمے کے باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے دل میں ترکوں کی محبت بہت زیادہ ہے۔ میں نے جنرل کاشقن کے اعزاز میں "آرمی سروس کور" چک لالہ کے میس میں بہت بڑی دعوت دی۔ اس سے پہلے میں اس کانفرنس میں شرکت کر چکا تھا جس کے لیے تُرکی کا یہ جرنیل پاکستان میں آیا تھا۔

جنرل کاشقن کو دیکھتے ہی مجھے پینتیس سال پہلے کا دَور یاد آگیا جب پہلی جنگِ عظیم شدت سے لڑی جا رہی تھی۔ میں اُس وقت رسالے میں تھا۔ ہمارے بیشتر قارئین رسالے سے واقف نہیں ہوں گے۔ آج کل رسالے کو ٹینک رجمنٹ کہا جاتا ہے۔ پُرانے وقت کے فوجی ٹینک رجمنٹ کو اب بھی رسالہ (کیولری) کہتے ہیں۔ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے پہلے رسالے میں گھوڑے ہُوا کرتے تھے جن کے سوار رائفلوں، لمبی تلواروں اور برچھیوں سے مسلح ہوتے تھے۔ افسروں کے پاس تلوار اور ریوالور ہوتے تھے۔ نہایت تندرست اور توانا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گھوڑے ہوتے تھے۔ ان کی اپنی ہی شان تھی۔ جنرل کاشقن کو دیکھ کر مجھے اپنا گھوڑوں والا رسالہ یاد آ گیا جس کے ساتھ میں میسوپوٹیمیا میں پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہُوا اور ہمارے مدِمقابل ترک اور عرب تھے۔

۱۹۵۰ء میں جب جنرل کاشقن پاکستان میں آیا تو میں نے اُسے فوراً پہچان لیا اور اُس نے مجھے کئی بار ایسی نظروں سے دیکھا جن میں سوال اور شک سا تھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور جب میں نے اُسے چک لالہ (راولپنڈی) میں "آرمی سروسس کور" کے میس میں مدعو کیا تو وہاں اُس نے مجھ سے پوچھا ___ "آپ کانفرنس کے دوران جب مجھ سے نظر ملاتے تھے تو آپ اس طرح مسکراتے تھے جیسے آپ مجھے جانتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ ایسا شک ہو رہا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں۔"

"جی ہاں" ___ میں نے اُسے یاد دلایا ___ "ہماری پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں عراق کے محاذ پر قلعہ شطرہ میں ہوئی تھی۔"

وہ مزید حیرت میں پڑ گیا۔ کہنے لگا ___ "قلعہ شطرہ پر تو ہمارا قبضہ تھا۔ ہم انگریزوں کے خلاف لڑے تھے۔ آپ انگریزوں کی فوج میں تھے پھر ہماری ملاقات وہاں کیسے ہو سکتی تھی؟"

"مجھے قلعہ شطرہ میں جنگی قیدی کی حیثیت سے آپ کے سامنے لے جایا گیا تھا" ___ میں نے جواب دیا ___ "اور میں آپ کی قید سے فرار ہو آیا تھا۔"

اُسے یکلخت سارا واقعہ یاد آ گیا۔ اُس نے کہا ___ "آپ افسر تھے۔ آپ کی ٹانگ شدید زخمی تھی، مگر آپ فرار کیسے ہوئے؟ وہاں سے تو کوئی تندرست آدمی بھی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ آپ زخمی ٹانگ سے کیسے بھاگ گئے تھے؟"

"وہ میرا جوانی کا دَور تھا" ___ میں نے کہا ___ "میں اُس وقت لوہے کی زنجیر توڑ سکتا تھا۔ میرا قد دیکھیے ساڑھے چھ فٹ کے قریب ہے۔ میں آرمی کا ایتھلیٹ تھا جس نے کئی ریکارڈ قائم کیے تھے۔ شطرہ قلعے کی بارہ فٹ اُونچی دیوار پھلانگنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔"

میری قید اور فرار کی داستان اس طرح شروع ہوتی ہے کہ عراق میں ترکوں

اور عربوں نے انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میرا رسالہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں بصرہ کے لیے روانہ ہُوا۔ پانچ دنوں بعد جہاز شط العرب میں داخل ہُوا۔ آگے دیکھا کہ ترکوں کے تین بحری جہاز دریا میں ڈوبے پڑے تھے اور آگے جانے کا راستہ نہ ہونے کے برابر تھا معلوم ہُوا کہ یہ تین جہاز ترکوں نے انگریزوں کا راستہ روکنے کے لیے دریا میں خود ہی ڈبوئے ہیں۔ ہمارا جہاز نہایت آہستہ آہستہ پیچ در پیچ راستہ بناتا آگے نکل گیا اور ہمیں الف لیلیٰ کا بصرہ نظر آنے لگا مگر وہاں کوئی گودی نہیں تھی۔ ہمیں حکم ملا کہ اپنا اپنا سامان سر پر اُٹھا کر دریا میں اُتر جاؤ۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی اور گھٹنے گھٹنے پانی میں اُتر گئے۔ گھوڑوں کو کرینوں سے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا جاتا اور جوان انہیں پکڑ کر کنارے پر لے جاتے۔ اس انوکھے طریقے سے کئی گھوڑوں کو چوٹیں آئیں۔

ہم سارا دن اور ساری رات سامان اور گھوڑے اتارتے رہے اور کیمپ تک پہنچاتے رہے۔ تین چار دن تیاری میں صرف ہو گئے۔ ہمیں ابھی آگے جانا تھا۔ بصرہ سے کُرنا، دریا کے کنارے ہمیں پیدل لے جایا گیا۔ کُرنا سے ناصریہ تک کے لیے ہمیں بڑی دریائی کشتیوں پر جنہیں بلم کہا جاتا تھا، سوار کرایا گیا۔ ایک ایک دخانی جہاز کے پیچھے چار سے چھ بلم باندھے گئے اور ہم جھیل الحمار میں پہنچے۔ جھیل میں پانی کی کمی کی وجہ سے جہاز (سٹیمر) ریت میں پھنس گیا۔ اسے نکالنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو جہاز کے کپتان نے وائرلیس کے ذریعے مدد مانگی۔ رات کے وقت عربوں نے ہم پر فائر کھول دیا بہت دیر تک ہم پر گولیاں برستی رہیں لیکن پانی میں گرتی رہیں۔ اگلے دن ہم کشتیوں کو گھسیٹتے رہے۔ ہماری مدد کے لیے ناصریہ سے دو گن بوٹیں آئیں لیکن ان کے لیے پانی تھوڑا تھا۔ ہم کشتیوں کو گھسیٹ کر اُن تک پہنچے اور اس طرح کچھ اُن کی مدد سے اور کچھ اپنی مشقت سے ہم ناصریہ پہنچ گئے۔

ناصریہ جو دریائے فرات کے کنارے واقع ہے، پہلے ہی دو گورا اور چار ہندوستانی پلٹنیں، ایک مونٹین توپ خانہ، ایک ہارس توپ خانہ،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ایک میڈیم توپ خانہ اور ایک ہیوی بیٹری پہنچ چکی تھیں۔ ہمارے رسالے کو چند میل دُور تک کے علاقے کی دیکھ بھال کا حکم ملا۔ پیادہ پلٹنیں بھی اسی کام میں مصروف تھیں۔ یہ دیکھ بھال چند دن جاری رہی۔ عربوں نے کئی بار دُور سے ہم پر فائرنگ کی لیکن وہ قریب نہ آئے۔ ہمارے کچھ سوار اور گھوڑے زخمی ہو گئے۔ پھر برطانوی فوج کی مزید پلٹنیں آگئیں جنہیں دریا کے دوسرے کنارے خیمہ زن کیا گیا اور فوجوں کی آمد و رفت کے لیے دریا پر کشتیوں کا پُل بنا دیا گیا۔

تُرکوں نے انگریزوں کی گن بوٹوں (جنگی کشتیوں) کو دُور پیچھے رکھنے کے لیے ہلّہ کے قریب دریا کے کنارے کاٹ دیئے جس سے پانی دُور دُور تک پھیل گیا اور دریا کی گہرائی کم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہماری فورس گن بوٹوں کی مدد سے محروم ہو گئی۔ دوسرا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم تک راشن اور گولہ بارود پہنچنا بند ہو گیا۔ دریا ہی سے سپلائی آتی تھی۔ اس کا پانی ترکوں نے پھیلا دیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں بہت ہی ناقص آٹا ملنے لگا۔ چینی کی جگہ سیاہ کالا گڑ آنے لگا۔ گوشت بالکل ہی بند ہو گیا۔ اچھا راشن صرف انگریزوں کو ملتا تھا۔ ہندوستانی فوج میں پیچش کی وبا پھوٹ پڑی۔ وہاں کھجوروں کے باغ تھے۔ ہم وہاں سے کچی کھجوریں توڑ کر کھاتے تھے۔ پکی ہوئی کھجوریں گوروں کو ملتی تھیں۔ دراصل لارڈ کچنر کی سکیم کے تحت ہندوستانی فوج کو دوسرے درجے کی فوج کی حیثیت دی گئی تھی جس کا کام ملک کے اندر امن کا تحفظ تھا، اس لیے ہندوستانی فوج کو میدانِ جنگ میں فوج والی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا امیدانِ جنگ میں اسے راشن پانی پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ البتہ انگریزی فوج کے لیے تمام تر انتظامات کیے گئے تھے۔

اس علاقے میں کئی کنوئیں بھی تھے مگر وہ ترکوں نے بھر دیئے تھے تاکہ انگریزوں کے کام نہ آسکیں۔ ہندوستانی سپاہی نیم فاقہ کشی، پیاس اور بیماریوں سے تنگ آ گئے۔ انہوں نے آخر انگریزی فوج کا راشن چوری کرنا شروع کر دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ انگریزوں کا راشن بڑی کشتیوں میں آتا تھا جس کے

ملّاح عرب ہوتے تھے۔ رات کے وقت ہندوستانی سپاہی چینی، فروٹ اور دودھ کے ڈبے جو انگریز افسروں اور سپاہیوں کے لیے آتے تھے کشتیوں میں سے چُرا لاتے۔ اس میں کچھ عربی ملّاحوں کو دے دیتے اور جب ہندوستانی اپنے کیمپوں میں پہنچ جاتے تو عربی ملّاح اپنے حصّے کا سامان اِدھر اُدھر چھپا کر "چور، چور" کا شور بپا کر دیتے۔ انگریز افسر یہ سمجھتے کہ چوری کرنے والے عرب کے لوگ ہیں۔ راشن چوری کی وارداتیں یہاں تک بڑھ گئیں کہ انگریزوں کے لیے جو دُنبے اور بکرے آتے تھے وہ بھی چوری ہونے لگے۔ ان کی کھالیں اِدھر اُدھر پڑی ملتی تھیں۔

راشن چوری کی وارداتیں اور ہندوستانی فوج کی ناگفتہ بہ حالت ایسے عروج پر پہنچ گئی کہ برطانیہ تک رپورٹ گئی۔ محکمۂ جنگ نے ایک کمشن بھیجا جس نے فرنٹ پر جا کر اپنی آنکھوں تمام کوائف کا مشاہدہ کیا۔ تب ہندوستانی فوج کی قسمت کھُلی۔ معلوم ہُوا کہ کاغذات میں ہندوستانی سپاہیوں کو نہایت اچھا راشن اور دیگر سامان ملتا تھا مگر عملاً فاقہ کشی تھی۔ کمشن کی رپورٹ پر ہندوستانیوں کو مکمل اور صحیح راشن اور اچھی وردی ملنے لگی۔

عراق فرنٹ کی اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ ترکوں نے انور پاشا کی کمان میں انگریزوں کے جنرل ٹاؤنسینڈ کو سلیمان پاک میں شکست دے کر پسپا کیا اور اب اُسے کوۃ العمّارہ میں محصور کر رکھا تھا۔ ناصریہ میں ہماری فورس کا کمانڈر جنرل گورینج تھا۔ اُسے حکم ملا کہ کوۃ العمّارہ میں ترکوں پر حملہ کر کے جنرل ٹاؤنسینڈ اور اُس کی فورس کو محاصرے سے نکالا جائے۔ میرے رسالے کو حکم دیا گیا کہ ناصریہ کے گرد پچیس میل کے دائرے میں دیکھ بھال (ریکی) کی جائے اور دشمن کی پوزیشن، عزائم اور تیاریوں کی معلومات فراہم کی جائیں۔ انگریزوں کے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں یہ اطلاع دی کہ شطرہ کے شیخ کا کوۃ العمّارہ اور ناصریہ کے درمیانی علاقے میں پورا پورا اثر ہے اور وہ انگریزوں کا حامی اور خیر خواہ ہے، اس کی مدد سے رسالہ شطرہ کے قلعے کے تین میل قریب تک جا سکتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں اپنے رسالے کے ساتھ دیکھ بھال کے مشن پر نکلا۔ تین دن اور دو راتیں میرا رسالہ شطرہ سے ناصریہ تک دیکھ آیا۔ اس دوران پولٹیکل آفیسر ساتھ رہا۔ اس علاقے کے چھوٹے بڑے شیخوں (سرداروں) سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ ایک شیخ نے پولٹیکل آفیسر کے اعزاز میں شہسواری کا مظاہرہ دکھایا۔ میں نے عربوں کی شہسواری کے بہت قصّے سُن رکھے تھے۔ اب اتفاق سے یہ مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ چار نوجوان عربی لڑکیاں گھوڑوں پر سوار میدان میں آئیں۔ شیخ نے بتایا کہ آپ فرض کرلیں کہ تمام مرد باہر گئے ہوئے ہیں۔ گھروں میں صرف عورتیں ہیں یا اونٹ بکریاں اور گھوڑے۔ دشمن قبیلے نے حملہ کر دیا ہے۔ اب دیکھئے عورتیں کس طرح مقابلہ کرتی ہیں۔

میدان میں جگہ جگہ بھوسہ بھری بوریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ چار نوجوان لڑکیوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑائے۔ اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ کسی نے تلوار منہ میں پکڑ رکھی تھی اور کسی نے کمر سے باندھ رکھی تھیں۔ لڑکیاں گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑاتی دائیں بائیں گھماتی، بوریوں (ڈمیوں) پر فائر کرتی تھیں۔ ان کے نشانے بالکل صحیح تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ گھوڑوں پر زین نہیں تھی۔ لڑکیاں ننگی پیٹھ پر سوار تھیں اور وہ گھوڑے کی پیٹھ کو ٹانگوں میں دبا کر کنٹرول کرتی تھیں۔ شیخ کے سامنے آکر لڑکیاں بھاگتے گھوڑوں سے کُود آئیں اور گھوڑے اپنے آپ رُک گئے ——— میں اپنے آپ کو شہسوار کہلانے میں حق بجانب ہوں۔ یہ تو میرا آبائی فن تھا۔ پھر عمر کا ایک بڑا حصہ جنگی شہسواری میں گذرا مگر میں عربی لڑکیوں کی شہسواری سے بہت متاثر ہُوا۔

پولیٹیکل ایجنٹ نے ان عربوں کے دوستانہ سلوک سے متاثر ہو کر جنرل گورینج کو وثوق سے کہہ دیا کہ پیشقدمی کے لیے حالات سازگار ہیں۔ چنانچہ میرے رسالے کو، نمبر ۱۲ بریگیڈ کو، نمبر ۳۰ مؤنٹیں توپخانے اور گھوڑوں کے توپ خانے کو پیشقدمی کا حکم ملا۔ ہم نے شیخ شطرہ کے قلعے سے چار میل کے فاصلے پر قیام کیا۔ یہ جگہ ناصریہ سے تیرہ میل دُور تھی، مگر یہ علاقہ سات سے نو فٹ گہرے برساتی نالوں اور تیس سے چالیس فٹ تک اُونچے ٹیلوں اور خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا اور

وہاں سات میل قطر کی ایک جھیل بھی تھی جو مرغابیوں سے اَٹی رہتی تھی۔

دوسرے دن جنرل گورینج، پولیٹیکل آفیسر کے ساتھ شطرہ کے شیخ سے ملنے گیا۔ اُس کی حفاظت کے لیے کچھ پیادہ کمپنیاں ساتھ گئیں۔ میرا ٹروپ (بتیس گھوڑے) بھی ساتھ تھا۔ شیخ چند اور شیخوں کے ساتھ ہمارے جرنیل کے استقبال کے لیے قلعے کے دروازے میں آیا۔ پیادہ کمپنیاں باہر کھڑی رہیں۔ البتہ میرے رسالے کو اندر جانے کی اجازت مِل گئی۔ یہ درمیانہ سائز کا قلعہ تھا۔ اس کے گرداگرد وجودیوار تھی وہ بارہ فٹ اُونچی تھی۔ ان دیواروں کے اُوپر چھوٹے چھوٹے مینار اور دیوار میں فائر کرنے کے لیے سوراخ تھے۔ اندر شیخ کا مضبوط قلعہ تھا۔ جنرل گورینج کی خاطر و مدارات کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے شیخ نے دروازے تک ساتھ جا کر الوداع کیا۔ جتنی دیر ہمارا جرنیل اندر رہا، میں قلعے اور اس کی ساخت اور دیگر کوائف کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بالکل علم نہ تھا کہ یہ جائزہ مجھے چند دنوں بعد ہی کتنا اہم فائدہ دے گا اور یہ قلعہ میری سپاہیانہ زندگی کا سنگِ میل بن جائے گا۔

شیخ شطرہ نے بڑے تپاک سے جنرل گورینج کو رخصت کیا۔ پیادہ اور سوار حفاظتی دستے چل پڑے۔ شیخ قلعے کے اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ قلعے کے میناروں پر جو عربی سنتری کھڑے تھے وہ سر سے عبا اتار کر سر کے اُوپر گول دائرے میں لہرا رہے تھے۔ اندرونی قلعے کی چھت پر بھی مجھے کچھ آدمی اسی طرح عبائیں لہراتے نظر آئے۔ میں سمجھا کہ یہ ہمیں الوداع کہنے کا ایک انداز ہوگا مگر اچانک ہم پر ہر طرف سے فائر ہونے لگا۔ دھماکوں کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گولیاں دُور سے فائر ہو رہی ہیں۔ جنرل گورینج نے ہمیں تیز چلنے کا حکم دیا۔ ہم نے گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں اور قلعے سے دُور آگئے مگر ہمیں بہت جلدی احساس ہو گیا کہ ہم گھیرے میں آگئے ہیں اور اس سے زندہ نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔ تب مجھے محسوس ہُوا کہ یہ شیخ شطرہ کی چال تھی بلکہ اُس نے انگریز جرنیل کے لیے دوستی کا جال بچھایا تھا اور قلعے سے جو عبائیں ہِل رہی تھیں وہ اُن ترکوں اور عربوں کے لیے اشارہ تھا جنہیں جنرل گورینج اور اس کی مختصر سی حفاظتی فورس کو محاصرے میں لینے کے لیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تیار رکھا گیا تھا۔

جنرل گورینج نے پیادہ دستوں کو حملے کی ترتیب میں کر کے حملے اور پیش قدمی کا حکم دیا مگر ترک اور عرب محاصرہ بہت تیزی سے تنگ کرتے آ رہے تھے۔ جنرل گورینج نے ہمیں حکم دیا کہ رسالہ چارج کرے یعنی ہلّہ بولے اور محاصرے کو چیر کر نکل جائے۔ میں نے اپنے ٹروپ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے حکم دیا کہ تین مختلف جگہوں پر ہلّہ بولیں اور محاصرے سے نکل کر کسی ایک مقام پر اکٹھے ہو جائیں۔ محاصرے کی نوعیت اور شدت کو دیکھ کر میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میرے کتنے سوار محاصرے سے نکل کر میرے اگلے حکم کے لیے اکٹھے ہو سکیں گے۔ سواروں نے تلواریں سونت لیں اور ہلّہ بول دیا۔ میرے ساتھ اب بمشکل دس گیارہ سوار رہ گئے تھے۔ میں نے کئی ایک سواروں کو گھوڑوں سے گرتے دیکھا۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑوں میں جا رہے تھے۔ ہمیں اپنے توپ خانے کی بروقت مدد مل گئی تھی۔ گولہ باری انہی مقامات پر کی گئی جہاں سوار ہلّہ بولنے جا رہے تھے۔ اس سے بہت مدد ملی اور ہم گھیرے سے نکل آئے لیکن صورتِ حال بڑی ہی خطرناک تھی۔ یہ محاصرہ بڑے حملے کا پیش خیمہ تھا۔

جنرل گورینج نے ہمارے رسالے کی ایک فائٹنگ پٹرول ناصریہ بھیجی تاکہ ساری فورس کو حملے کی اطلاع مل جائے اور کمک تیار رہے۔ چند مزید پٹرولیں (گشتی پارٹیاں) مختلف سمتوں کو روانہ کی گئیں۔ میرا ٹروپ پولیٹیکل افسر کے ساتھ رہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے شیخوں سے ملتا رہا۔ آخر ہم نے جھیل کے کنارے کیمپ لگایا۔ ہم گھوڑے اس طرح باندھا کرتے تھے کہ ایک لمبا اور مضبوط رسّہ دونوں سروں سے زمین میں گاڑ دیتے تھے اور گھوڑوں کا ایک ایک پاؤں ایک ایک رسّی سے اس رسّے کے ساتھ باندھ دیتے تھے ہندوستان میں تو زمین مضبوط ہوتی تھی جس میں گاڑا ہُوا رسّہ باہر نہیں نکلتا تھا مگر عرب کی زمین ریتلی تھی۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ رسّہ ذرا سے زور سے نکل آئے گا۔

رات کے وقت عربوں نے ہمارے کیمپ پر فائر کیا۔ کچھ گولیاں پانی

میں لگیں اور کچھ گھوڑوں کے اُوپر سے گذر گئیں۔ جھیل سے مُرغابیاں گھبرا کر غول در غول پھڑ پھڑا کر اُڑیں۔ گھوڑے قریب ہی بندھے تھے وہ بدک گئے اور سب گھوڑوں نے ایک ہی بار زور لگایا تو ریتلی زمین میں گڑا ہُوا رسّہ زمین سے نکل آیا۔ ایک ہی رسّے سے بندھے ہوئے بتیس گھوڑے بدک کر دوڑے تو کیمپ کا سامان اور خیمے ساتھ ہی لیتے گئے۔ بعض نے رسیاں تڑا لیں اور ان میں سے کچھ عربوں کی طرف چلے گئے اور انہی کے کام آئے۔ بعض کی رسیاں آپس میں اُلجھ گئیں اور وہ رُک گئے اور جو اکٹھے بندھے ہوئے بھاگتے دوڑتے رہے، انہوں نے کیمپ کی کوئی چیز سلامت نہ چھوڑی۔ صبح کے وقت ہم گھوڑوں کی خاصی تعداد سے محروم ہو چکے تھے۔ میرا گھوڑا خود ہی میرے پاس آ گیا۔ یہ گھوڑا میرے والد صاحب نے مجھے دیا تھا اور اسے میں نے خود ہی ٹریننگ دی تھی۔ مجھے اس گھوڑے سے اور گھوڑے کو مجھ سے بے حد پیار تھا۔

دوسرا دن کیمپ کو سنبھالتے اور نقصان پورا کرتے گذر گیا۔ گھوڑوں نے خوب تباہی مچائی تھی۔ جنرل گورینج نے رسالے کی فائٹنگ پٹرولیں مختلف اطراف کو بھیجیں تاکہ دشمن کے عزائم کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ جب یہ پارٹیاں آگے بڑھتی رہیں ان پر ایک بھی گولی نہ چلی مگر واپسی کے وقت عرب سواران پر ٹوٹ پڑے۔ وہ کسی ایک جگہ رُک کر یا کہیں زمین پر پوزیشن لے کر فائر نہیں کرتے تھے بلکہ گھوڑے سرپٹ بھگاتے آتے تھے اور رائفل دونوں ہاتھوں میں تھام کر فائر کرتے تھے۔

جنرل گورینج نے آگے بڑھنے کی بجائے ناصریہ کی طرف پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جوں ہی کیمپ اُکھڑنا شروع ہُوا، عربوں نے گولیوں کا مینہ برسا دیا۔ میں نے عربوں کی جنگی شہسواری کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ گھوڑے پوری رفتار سے دوڑاتے اور فائر کرتے ہمارے کسی دستے کی طرف آتے اور قریب آ کر یکلخت گھوڑوں کو موڑ لیتے۔ جوں ہی گھوڑے مڑتے، عرب سوار فوراً زین پر گھوم کر گھوڑے کی دُم کی طرف ہو جاتے اور فائر کرتے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہوئے کسی کھڈ نالے میں غائب ہو جاتے۔ میں ان کی دلیری اور شہسواری پر حیران تھا۔ آج بھی میں انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں — انہوں نے ہماری پیادہ پلٹنوں کا بہت جانی نقصان کیا۔ میرا رسالہ پیادہ پلٹنوں کے پہلوؤں پر تھا۔

جنرل گورینج نے حکم دیا کہ پیچھے جو ٹیلوں کا سلسلہ ہے اس پر فوراً قبضہ کیا جائے تاکہ عرب وہاں قابض ہو کر نمبر ۱۲ بریگیڈ کا راستہ نہ روک سکیں۔ میرا رسالہ اُس طرف گیا تو عرب سوار وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ ہم نے گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں اور چارج کیا۔ عرب گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم پر فائرنگ کرتے ہُوئے غائب ہو گئے۔ ہمارے کئی ایک سپاہی شدید زخمی ہو گئے۔ ہماری جو پلٹن آگے تھی اس پر عربوں نے حملے تیز کر دیے جن کی تاب نہ لا کر پلٹن ٹیلوں تک پیچھے ہٹ آئی۔ ہماری مدد کے لیے ناصریہ سے کمک روانہ ہو چکی تھی مگر عرب شہسوار اس کمک کی بُری حالت کر رہے تھے۔ اس پر حملے کر کر کے اس کی رفتار بہت سُست کر رکھی تھی۔ ہمیں بالکل امید نہیں تھی کہ عرب اس کمک کو ہم تک پہنچنے دیں گے۔ جنرل گورینج نے اسی خطرے کے پیشِ نظر ہمارے رسالے کو ٹیلوں پر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا تاکہ پلٹن جو آگے عربوں کی زد میں آئی ہوئی ہے، کمک کا انتظار کرنے کی بجائے پیچھے ہٹے اور کمک سے جا ملے۔

ہمارے پاس ایمونیشن کم رہ گیا تھا۔ ہمیں ہلّہ بولنے کا حکم ملا۔ ایک پہاڑی پر مؤنٹین توپ خانے کی چند ایک توپیں لگی ہُوئی تھیں۔ ان کے متعلق خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ عربوں کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ ہم نے ہلّہ بولا اور عربوں سے توپوں کو محفوظ تو کر دیا لیکن میرا سکواڈرن کمانڈر میجر ٹاؤرڈین سخت زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا۔ عربوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ میں اپنے گھوڑے سے کُودا۔ میجر ٹاؤرڈین کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر ڈالا اور گھوڑا دوڑا کر توپخانے کے مورچے میں لے گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ کرنل وِنٹل اور میجر ولسن بھی شدید زخمی ہو گئے ہیں اور جمعدار ایجوٹنٹ اُتم سنگھ انہیں اٹھانے کے لیے گیا تو دو گولیوں سے

وہ مر گیا۔ میں دوڑتا گیا اور دونوں فوجی افسروں کو پیٹھ پر اُٹھا کر لے آیا۔ وہاں سے میں اپنے رسالے سے جا ملا۔ معلوم ہُوا کہ ہمارا رسالہ بہت جانی نقصان اُٹھا چکا ہے اور کئی گھوڑوں سے محروم ہو چکا ہے۔

یہ معرکے کا نازک اور خطرناک مرحلہ تھا۔ جنرل گورینج بار بار رسالے سے حملے کراتا تھا تاکہ پیادہ پلٹنوں کو پیچھے ہٹایا جا سکے۔ میرے رسالے کے تمام انگریز افسر مارے گئے یا شدید زخمی ہو گئے اور جمعدار، رسالدار بھی عربوں کی نذر ہو گئے تھے۔ میں اکیلا افسر رہ گیا تھا۔ توپ خانے کے کرنل (بعد میں جنرل) گرین نے مجھے کہا کہ بائیں طرف اپنی دو توپیں سخت خطرے میں ہیں، ان پر ترکوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اگر بروقت مدد نہ پہنچی تو توپیں ترک گھسیٹ کر لے جائیں گے۔

ہم نے برچھیوں سے حملہ کیا۔ ترک پیچھے تو ہٹ گئے لیکن ہمارا بہت جانی نقصان کر گئے۔ ہمارے بہت سے جوان ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ میں نے حملہ جاری رکھا تاکہ زخمیوں کو اٹھایا جا سکے۔ اس کوشش میں ایک گولی میرے گھوڑے کے سر میں لگی اور دوسری گولی اتنے قریب سے آئی کہ گھوڑے کے پیٹ میں سے گزر کر میرے گھٹنے سے بھی پار ہو گئی۔ گھوڑا اس طرح گرا کہ میں اس کے نیچے آ گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میرے سواروں نے مجھے گرتے اور گھوڑے کے نیچے دبتے دیکھا۔ وہ اس یقین کے ساتھ بھاگ گئے کہ میں مر گیا ہُوں۔ میرے مرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ گھوڑے کے بوجھ تلے مجھے مرنا ہی تھا۔

میں ہوش میں آیا تو شام ہو گئی تھی۔ میرے اردگرد بہت سے آدمی کھڑے تھے۔ ذہن اچھی طرح بیدار ہُوا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب عرب تھے۔ میری وردی میرے اپنے اور گھوڑے کے خون سے لال سُرخ ہو گئی تھی۔ ایک عرب نے مجھے وردی اتارنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرا ریوالور اور میری تلوار چھین چکے تھے۔ انہوں نے میرے بُوٹ بھی اُتروا دیئے اور مجھے گھوڑے پر لاد کر شطرہ قلعے میں لے گئے۔ چند ہی دن پہلے اسی قلعے میں ہمارا شاہی استقبال کیا گیا تھا۔ اب میں اسی قلعے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں زخمی اور بے بس قیدی کی حیثیت سے داخل ہُوا۔ مجھے شیخ شطرہ اور ایک ترکی افسر کے سامنے کھڑا کیا گیا — یہ کیپٹن کا شفتن تھا۔ شیخ شطرہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کیپٹن کا شفتن کے حکم سے میرے گلے میں رسّی ڈال دی گئی اور مجھے اُس کے خیمے کے سامنے کھجور کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا جس طرح جانوروں کو باندھتے ہیں۔

میرے زخم کی کسی نے پرواہ نہ کی نہ مرہم پٹی کی۔ سب مجھے غصے سے گھُورتے تھے میرے جسم پر واحد جو کپڑا تھا وہ ایک انڈرویئر تھا۔ رات کے وقت انہوں نے میرے آگے روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے پھینک دیئے اور مٹی کے کُوزے میں پانی میرے قریب رکھ دیا۔ میں نے نہ روٹی کے ٹکڑوں کو ہاتھ لگایا نہ پانی پیا مگر رات کے وقت بھوک نے اتنا مجبور کر دیا کہ میں نے روٹی کے ٹکڑے کھا لیے اور پانی پیا۔ یہ جَو کی روٹی تھی۔ مجھے زخم پریشان کر رہا تھا۔ خون بہت نکل گیا تھا جس سے جسم میں کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ مسلسل کئی روز لڑنے اور آرام نہ کرنے کے بداثرات الگ تھے۔ پھر بھی میں فرار کی ترکیبیں اور راستے سوچ رہا تھا۔

آدھی رات کے وقت قلعے کے اندر سکوت طاری ہوگیا۔ جنگ کی وجہ سے کوئی بتّی نہیں جل رہی تھی۔ ہر سُو گھُپ اندھیرا تھا۔ میں نے رسّی کی مضبوطی کو دیکھا۔ اللہ نے مجھے جسمانی قوت بھی عطا کی تھی اور قوتِ ارادی بھی۔ میں نے رسّی توڑ لی اور میں قلعے کی بارہ فٹ اُونچی دیوار پھلانگ کر قلعے سے نکل گیا۔ میں جب یہاں جنرل گورینج کے ساتھ اس قلعے میں آیا تھا تو قلعے کے محلِ وقوع اور دیگر کوائف کا جائزہ بغور لیا تھا۔ وہ جائزہ میرے کام آیا۔ اُس وقت مجھے اپنے بچپن کے زمانے کے ایک مشہور ڈاکو ستّی کی باتیں یاد آئیں اور یہ باتیں میرے کام بھی آئیں۔

میرے گھٹنے سے گولی پار ہوگئی تھی۔ درد کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ ٹانگ بیکار ہو گئی تھی لیکن میں نے درد اور معذوری کو قبول نہ کیا۔ انسان کچھ کرنے کا عزم رکھتا ہو تو جسمانی درد اور معذوریاں اُس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں۔

دریائے دجلہ قریب ہی تھا۔ میں دریا میں اُتر گیا اور بہاؤ کے ساتھ تیرنے لگا۔ باقی رات تیرتے گزری۔ صبح طلوع ہونے لگی۔ میں دریا سے نکلا اور کھجوروں کے

ایک باغ میں جا چھپا۔ جنگ کی وجہ سے باغ کے اندر اور باہر کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ دُور سے عربوں کی آوازیں سنائی دیں اور گھوڑوں کی گرد بھی دکھائی دی۔ میں نے سارا دن وہیں چُھپ کر گزار دیا۔ گھٹنے کے زخم پر کوئی مرہم پٹی نہیں ہوئی تھی۔ زخم ننگا تھا۔ میں خود بھی ننگا تھا۔ زخم پر کیا باندھتا! ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہُوا تو میں دریا کی طرف چل پڑا۔ ٹانگ اکڑتی جا رہی تھی۔ گھٹنہ ہلتا تھا تو درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ میں دریا میں اُتر گیا اور بہاؤ کے ساتھ تیرنے لگا۔

دریائے دجلہ کے ساتھ ہماری کتنی ہی پیاری اور جذباتی یادیں وابستہ ہیں۔ اسلام کی جنگی تاریخ میں دجلہ کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اس دریا نے کتنے ہی معرکے دیکھے ہیں۔ اس کے کنارے کتنی ہی بار خون میں ڈوبے ہیں۔ اس کی روانی تاریخ کی ولولہ انگیز کہانیاں سناتی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ میں عربوں اور ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا لیکن میں دجلہ کا ہی سپوت تھا اور دجلہ مجھے آغوش میں لیے بڑے پیار سے خطروں سے دُور ہی دُور، دُور ہی دُور لے جا رہا تھا اور میرے درد کو سہلا رہا تھا۔

صبح طلوع ہونے سے ذرا پہلے میں دریا سے نکلا اور ایک گہرے نالے میں چُھپ گیا۔ میرے قریب سے بہت سے عربی سوار گزرے۔ وہ غالباً ناصریہ میں ہمارے کیمپ پر رات کو فائرنگ کرتے رہے تھے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے پہلے اپنے اپنے ٹھکانے پر جا رہے تھے۔ وہ میرے بہت ہی قریب سے گزرے۔ میرا دل ڈوبنے لگا مگر سحر کے دھندلکے میں وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ میں اُٹھا اور چل پڑا۔ اب تو گھٹنہ چلنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ زخم میں پانی چلا گیا تھا۔ درد ناقابلِ برداشت تھا۔ بھوک اور پیاس الگ پریشان کر رہی تھی مگر مجھے چلنا تھا اور کیمپ میں پہنچنا تھا۔ میں قوتِ ارادی کے زور پر چلتا گیا۔ صحرا نے مجھے کڑے امتحان میں ڈال دیا۔ میں نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا۔ سورج میرے ننگے جسم کو جھلساتا رہا اور میں دن بھر زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا رہا۔ رات کے وقت میں ناصریہ کیمپ کے قریب پہنچ گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

صبح طلوع ہوئی۔ میرے رسالے کے چند ایک سوار اِدھر سے گزرے۔ وہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اپنی گشتی ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ یہ ڈوگرا سیکشن تھی۔ ایک سوار میرے ساتھ ہو گیا۔ اُس نے اپنی پانی کی بوتل مجھے دے دی جو میں نے پی لی۔ اُس نے مجھے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ جب میں اپنے کیمپ میں پہنچا تو رسالے کا نیا کمانڈنگ آفیسر آ چکا تھا۔ اُس نے مجھے وردی پہننے کو بھیج دیا۔ میں اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا تو میرا اردلی میراں بخش جو میرپور آزاد کشمیر کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، راستے میں مل گیا۔ وہ تو مجھے مُردہ سمجھ چکا تھا۔ ہر کسی کو یقین تھا کہ میں مر گیا ہُوں میں نے اُسے پکارا ــــ "میراں بخش میں آ گیا ہُوں" ــــ میراں بخش نے جب مجھے نگاہ بھر دیکھا اور میرے جسم کو ریت سے لتھڑا ہُوا دیکھا تو وہ سمجھا کہ میں مرے ہُوئے اکبر خان کا بھُوت ہوں۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں، پھر اُس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ چیختا چلّاتا، سخت خوف زدہ اُلٹے پاؤں بھاگا مگر زیادہ دوڑ نہ سکا۔ دہشت سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میں وردی پہن کر کمانڈنگ آفیسر سے ملا۔ مجھے ہسپتال بھیج دیا گیا لیکن میراں بخش ہوش میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو اُس نے کہا کہ اپنے مولوی سے کہو کہ آئے اور اُس کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھے یا دم کرے۔ مولوی کو بلایا گیا جس نے دم درود کیا مگر میراں بخش نے بیدار ہوتے کئی دن لگا دیئے۔

تو یہ ہیں میری وہ یادیں جو ترکی کے کمانڈر انچیف جنرل کاشفن کو دیکھ کر تازہ ہو گئی تھیں۔ میں نے چک لالہ (راولپنڈی) کے مَیس میں اُسے اپنے فرار کی روئیداد سنائی تو اُس نے بہت لطف اُٹھایا۔ اُس نے تو مجھے اپنے خیمے کے سامنے کھجور کے درخت کے ساتھ جانوروں کی طرح باندھ دیا تھا۔ جنرل کاشفن میرے گہرے دوست بن گئے۔ اُس وقت جنرل گرُوسل اُن کے چیف آف سٹاف تھے جو بعد میں ترکی کے کمانڈر انچیف بنے اور پھر ترکی کے صدر بن گئے تھے جنرل کاشفن نے جب دیکھا کہ میرے دل میں ترکوں کی کتنی محبت ہے اور میں ان کی جنگی اہلیت اور شجاعت کا کتنا شیدائی ہوں تو انہوں نے ترکی جا کر مصطفےٰ کمال پاشا کے میرے لیے جنگی نقشے اور حالات بھیجے۔ ان کی مدد سے میں نے تین کتابیں لکھیں

"مُصطفےٰ کمال پاشا" "اتاترک" اور "ترکوں کا جہاد"۔

تھوڑا عرصہ گزرا جنرل کاشفن کا بھتیجا کراچی میں مِلا تھا۔ وہ اُس وقت استنبول کا میئر تھا ــــ میں ترکوں، عربوں اور دجلہ کے مقدّس پانی کو عقیدت کا سلام پیش کرتا ہوں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جب ہم نے دہشت پسندوں کو پکڑا

۱۹۱۴ء میں میرا رسالہ میرٹھ چھاؤنی میں گیا۔ میں لانس نائک بن چکا تھا اور مزید ترقی کے لئے فسٹ کلاس رومن اردو کا امتحان دینے والا تھا۔ میں ہاکی کا نامی گرامی کھلاڑی تھا۔ ایک شام میں ہاکی گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں رسالے کے ایجوٹنٹ کیپٹن والٹن نے روک لیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک انگریز افسر ایک ہندوستانی لانس نائک کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ چند ایک اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُس نے مجھ سے پوچھا — "تم میرٹھ کالج کے ہاکی کے مشہور کھلاڑی حیدر کو جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں" — میں نے جواب دیا۔

"آخری بار اُسے کب ملے تھے؟"

"ٹورنامنٹ کے دوران" — میں نے جواب دیا — "کالج کی ٹیم ہم سے ہار گئی تھی۔"

"وہ رسالے کی گراؤنڈ میں کھیلنے نہیں آتا؟"

"میچ کے بغیر تو کبھی نہیں آیا۔"

"اگر حیدر یہاں آتے یا تمہارے پاس سے گزرے تو تم اسے پہچان لو گے؟"

"ضرور پہچان لوں گا۔"

"دیکھو" — کیپٹن والٹن نے رازداری سے کہا — "اس گفتگو کا کسی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سے ذکر نہ کرنا۔ کوئی پوچھے کہ صاحب کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں تو کہنا کہ صاحب ہاکی ٹیم کے متعلق پوچھ رہا تھا۔"

دوسرے دن کیپٹن واٹسن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کہا — "تم کو آج سے ملٹری پولیس کی ڈیوٹی دی جا رہی ہے۔ اب اپنے آپ کو ملٹری پولیس میں سمجھو۔ تمہاری ڈیوٹی یہ ہوگی کہ میرٹھ شہر اور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشنوں پر ریل گاڑیوں سے رسالے کے جو جوان اور رنگروٹ آتے ہیں انہیں لائنز (رسالے کی بارکوں) میں لاؤ۔ ہر رات نو بجے مجھے آفیسرز میس میں رپورٹ دو کہ رات آٹھ بجے دہلی سے جو 'بمبئی میل' آتی ہے اس میں ہاکی کا کھلاڑی حیدر آیا ہے یا نہیں، لیکن یاد رکھو یہ ایک راز ہے۔ کسی کو بتانا نہیں کہ تمہاری ڈیوٹی میں حیدر کی سراغرسانی بھی شامل ہے۔"

ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ صبح چار بجے اٹھ کر پیدل میرٹھ چھاؤنی کے سٹیشن پر جانا پڑتا تھا۔ پنجاب کی طرف سے آنے والی تمام ریل گاڑیوں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک بجے تک لگا رہتا۔ شام کو میرٹھ شہر کے جنکشن سٹیشن پر تین بجے سے رات ساڑھے آٹھ بجے تک وہ تمام گاڑیاں دیکھنی پڑتیں جو غازی آباد، ہاتر س اور برانچ لائنز سے آتی تھیں۔ دو ماہ تک میں ہر رات نو بجے کیپٹن واٹسن کو رنگروٹوں اور جوانوں کی آمد کی رپورٹ دیتا رہا مگر حیدر نظر نہیں آیا۔

کیپٹن واٹسن نے ایک رات کہا — "حیدر چار پانچ بار یہاں آ چکا ہے۔ رات شہر یا چھاؤنی میں گزار کر چلا جاتا رہا ہے، لیکن پولیس کو اس وقت پتہ چلا جب وہ جا چکا ہوتا تھا۔"

میں بہت ہی حیران تھا کہ حیدر کون ہے اور پولیس اسے کیوں ڈھونڈ رہی ہے۔ میں کیپٹن واٹسن سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے رسالے کی نفری کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ رنگروٹ اور نئے گھوڑے دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ ہمارے رہنے کا انتظام بہت ناقص تھا۔ جن کمروں میں ہم رہتے تھے ان کی چھتیں پختہ نہیں بلکہ کھپریلیں تھیں۔ برسات میں ان پر کوا بھی بیٹھ جاتے تو کھپریل جھک جاتی اور پانی کمرے میں گرتا تھا۔ میں نے

ایک لمبا بانس رکھا ہوا تھا۔ رات بارش میں چھت سے پانی مجھ پر گرنے لگتا تو میں بانس نیچے رکھ کر چھت کو اٹھا دیتا تھا جس سے پانی کسی دوسرے جوان کی چارپائی پر گرنے لگتا تھا۔ اس طرح میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا قانون چلاتا تھا۔ میں ہاکی کا کھلاڑی بھی تھا، ایتھلیٹ بھی اور پہلوان بھی تھا۔ اس کے علاوہ میں ایجوٹنٹ کا منہ چڑھا ملٹری پولیس کا لانس نائک تھا، اس لئے کسی کو میرے منہ آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ایک رات میں اپنے کوارٹر سے باہر میدان میں سویا ہوا تھا۔ نصف شب کے وقت مجھے کیپٹن واٹسن نے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میرے کان میں کہا کہ ننگے پاؤں میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تین آدمی اندھیرے میں کھڑے نظر آئے۔ ذرا قریب گیا تو دیکھا کہ ان کے کپڑے کالے تھے اور ان کے آدھے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

کیپٹن واٹسن نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ ان کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ یہ لوگ رسالے کے سکھ سکواڈرن کے ایک بند کمرے کے دروازے پر دستک دیں گے۔ دروازہ کھلے گا۔ اندر روشنی ہوگی۔ اندر تمہیں دو سکھ نظر آئیں گے اور ایک بنگالی۔ تم بجلی کی تیزی سے بنگالی کو دبوچ لینا۔

"یاد رکھو" — کیپٹن واٹسن نے کہا — "اگر تم نے اس بنگالی کو ہلنے جلنے کی مہلت دی تو خود بھی مر دگے اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکے گا" — پھر کیپٹن واٹسن نے یہ انکشاف کر کے مجھے چونکا دیا — "یہ بنگالی ہاکی کا مشہور کھلاڑی حیدر ہوگا جسے تم اچھی طرح جانتے پہچانتے ہو۔"

یہ تین آدمی جن کے پیچھے مجھے کمرے میں داخل ہونا تھا، ان کے نام یہ بتاتے گئے — نادر خان، نادر شاہ اور زریں گل۔ بعد میں پتہ چلا کہ نادر خان ضلع راولپنڈی کے ایک مشہور قصبے گوجر خان کا رہنے والا ہے اور باقی دو پٹھان ہیں۔

ہم دبے پاؤں اس بند کمرے تک گئے۔ نادر خان نے ایک خاص انداز سے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

دستک دی۔ اندر سے بھی ایسی ہی دستک سُنائی دی۔ یہ باہر کی دستک کا جواب تھا بلکہ یہ کوئی پُراسرار اشارہ تھا۔ جونہی دروازہ کھُلا، نادر خان اور زریں گُل دونوں سکھوں پر جھپٹے۔ مجھے مدھم سی روشنی میں حیدر نظر آیا۔ میں نے ہدایت کے مطابق چیتے کی طرح جھپٹ کر اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لاتیں ماریں مگر مجھ جیسے چھ فٹ لمبے پہلوان کے شکنجے سے اُس کا نکلنا ناممکن تھا۔ کیپٹن والٹن اور نادر شاہ پستول تانے کھڑے تھے۔ رسّیاں ساتھ تھیں۔ حیدر اور دونوں سکھّوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ میں نے حیدر کو کندھے پر اُٹھا لیا۔ باہر گئے تو کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔ موٹر گاڑی تیار کھڑی تھی۔ قیدیوں کو اس میں ڈال دیا گیا۔

"جاکر سو جاؤ" —— کیپٹن والٹن نے مجھے کہا —— "اس سلسلے میں مُنہ بند رکھنا۔ کوئی پوچھے تو لاعلمی ظاہر کرنا۔ صبح سویرے روزمرّہ کی طرح ریلوے سٹیشن پر چلے جانا اور رات نَو بجے مجھے مَیس میں رپورٹ دینا۔"

عجیب ڈرامہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ چونکہ یہ ایک راز تھا اس لئے کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور سوچ سوچ کر میرا سر دُکھنے لگا کہ یہ حیدر کون ہے؟ کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہے وہ بنگالی نہیں۔ اپنے آپ کو لکھنؤ کا رہنے والا مسلمان بتایا کرتا تھا۔ صاف سُتھری اُردو بولتا تھا۔ میرٹھ کالج میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ بڑی ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور کالج میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اُن دنوں "لاہور سازش" کا بہت چرچا تھا۔ دہشت پسند تحریک زوروں پر تھی۔ کئی جگہوں پر بم پھٹنے کے واقعات ہو چکے تھے۔ "لاہور سازش" کے متعلق اخباروں میں کم ہی کچھ چھپتا تھا۔ افواہیں سُنی اور سنائی جاتی تھیں۔ ہم بارکوں میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ کانوں کان پتہ چلتا تھا کہ فلاں پلٹن کے اتنے سردار اور جوان پکڑے گئے ہیں یا یہ کہ انہیں لڑائی میں بھیج دیا گیا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل شروع ہو چکی تھی۔ بعد میں

پتہ چلتا کہ انہیں لڑائی میں نہیں بھیجا گیا بلکہ کورٹ مارشل کر کے انہیں یا تو عمر قید کی سزا دی گئی ہے یا پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔ اس طرح بے شمار فوجیوں کو عمر قید یا سزائے موت دی گئی۔ ہمارے رسالے کے "یونٹ آرڈر" میں اس قسم کی اطلاعات شائع ہُوا کرتی تھیں کہ فلاں سردار (جمعدار، رسالدار، رسالدار میجر) عہدیدار یا جوان کو لڑائی میں بھیجا گیا تھا مگر وہ بھگوڑا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اُس کی تنخواہ اور فیملی الاٹمنٹ بند کر دی گئی ہے۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اُسے درپردہ پھانسی دے دی گئی ہے یا عمر بھر کے لئے کالے پانی (جزائر انڈیمان) بھیج دیا گیا ہے۔

نادر خان، نادر شاہ اور زریں گُل غائب ہو گئے۔ میں نے انہیں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ انہیں رسالے کے عہدیدار ظاہر کیا گیا تھا۔ یونٹ آرڈر میں تینوں کے متعلق یہ اطلاع چھاپی گئی کہ انہیں لڑائی میں بھیج دیا گیا ہے۔

"لاہور سازش" کے متعلق بعض اخباروں میں مختصر سی یہ خبر شائع ہوئی کہ "کاماگاٹامارو" نام کی ایک دہشت پسند تحریک کے افراد بنگال سے پنجاب آ گئے ہیں جن میں سے کئی ایک کو گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ان کے خلاف مقدمات کی خفیہ سماعت ہو رہی ہے۔ ان مقدمات کے دوران جو انکشافات ہو رہے ہیں وہ ابھی مصلحتاً عوام کو نہیں بتلائے جائیں گے۔

چند ماہ بعد مجھے ترقی دے کر جمعدار بنا دیا گیا۔ (آج کل یہ عہدہ نائب رسالدار کہلاتا ہے)۔ اور اس کے ساتھ ہی رسالے کو سمندر پار جنگ میں جانے کا حکم مل گیا۔ رسالہ بصرہ پہنچ گیا۔ اس محاذ پر ہمارا سامنا عربوں اور تُرکوں سے تھا۔ بعد میں، میں تُرکوں کے ہاتھوں قید ہو گیا اور زخمی حالت میں قید سے بھاگ بھی آیا۔

ہندوستان کی متعدد پیادہ اور رسالہ یُونٹیں محاذ پر لڑ رہی تھیں۔ کچھ فرانس میں اور کچھ میسوپوٹیمیا (عراق) میں۔ ہم بصرہ پہنچے تو پہلی خبر یہ سُنی کہ ایک رسالے، ۱۵ ملتان لانسرز اور پٹھانوں کی ایک پیادہ پلٹن فرنٹیئر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

فورس نے تُرکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ یونٹیں فرانس سے آتی تھیں۔ ان سے ہتھیار لے کر نہتّہ کر دیا گیا تھا اور وہ گورا پلٹنوں کی زیرِ حراست تھیں۔

ایک انگریز جرنیل، جنرل نکسن نے فرنٹیئر فورس بٹالین کے صوبیدار میجر اکبر خان سے کہا ـــــ "دیکھو صوبیدار میجر صاحب! اپنے جوانوں کو سمجھاؤ اور ان کو ڈراؤ کہ ہم ان سب کو بغاوت کے جُرم میں گولی مار دیں گے۔"

مجھے آج تک اس پٹھان صوبیدار میجر کا جواب یاد ہے۔ اُس نے اس انگریز جرنیل کو جواب دیا ـــــ "صاحب بہادر! میرے سینے پر نظر ڈالو۔ یہ تمغے دیکھو۔ ہم نے جرمنوں کے خلاف لڑ کر، آئی۔ ڈی۔ ایس۔ ایم، آئی۔ او۔ ایم، اور ملٹری کراس، حاصل کیا ہے۔ یہ تمغے ہم نے بہادری کے صلے میں حاصل کئے ہیں، مگر صاحب بہادر! بہت افسوس ہے کہ تم ہم کو گولی سے ڈراتے ہو۔ تم کو کیا ہو گیا ہے صاحب بہادر؟.... جاؤ، جو مرضی ہے کرو۔ ہم کافر ہو کر نہیں مریں گے۔"

یہ پہلا واقعہ ہے جس نے میری بصیرت کو روشنی دی۔ دوسرا واقعہ نمبر ۱۵ لانسرز کا ہے۔ اس رسالے کا رسالدار میجر فرانس میں بیمار ہو کر ہسپتال چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ رسالدار یعقوب خان عارضی طور پر رسالدار میجر کی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے بھی جنرل نکسن نے وہی الفاظ کہے جو صوبیدار میجر اکبر خان کو کہے تھے۔ یعقوب خان کا جواب بہت ہی سخت، باغیانہ اور دانشمندانہ تھا جسے انگریز جرنیل برداشت نہ کر سکا۔ رسالدار یعقوب خان کو عمر قید کی سزا دے کر جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔

ایک رجمنٹ بنگال کی بھی تھی۔ یہ بنگال کی پہلی اور واحد رجمنٹ تھی۔ اس پوری کی پوری رجمنٹ نے بھی تُرکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا اور اس پوری کی پوری رجمنٹ کا اجتماعی کورٹ مارشل کر کے اسے عمر قید کی سزا دے کر جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۵ ملتان لانسرز اور فرنٹیئر فورس کو برما میں کہیں بھیج کر نظر بند کر دیا گیا تھا۔

پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ کالا پانی کیا ہے۔ جزائر انڈیمان خلیج بنگال کے دُور نیچے ایک بڑا جزیرہ اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ ہندوستان میں قاتلوں، پیشہ ور نامی گرامی ڈاکوؤں اور باغیوں کو عمر قید کی سزا دے کر انڈیمان بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے قیدی کے لئے فرار ناممکن ہوتا تھا ـــــ "فلاں کو کالا پانی بھیج دیا گیا ہے" ـــــ اسے کالا پانی اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان جزائر کے اردگرد سمندر بہت گہرا ہے۔ اتنی زیادہ گہراتی کی وجہ سے سمندر کا پانی نیلا نہیں بلکہ سیاہ نظر آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے یلغار کر کے جزائر انڈیمان پر قبضہ کر لیا تھا جو زیادہ دیر نہ رہ سکا لیکن کوئی ایک بھی قیدی واپس نہیں آ سکا تھا۔ اس کے بعد یہ قید خانہ بند کر دیا گیا تھا اور پھر برِصغیر تقسیم ہو گیا۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب مسلمان رسالے اور پلٹنیں تُرکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر چکے تھے، عراق کے محاذ پر انگریزوں کی حالت بہت بُری تھی۔ تُرکوں نے ان کے چھکے چھُڑا دیئے تھے۔ انگریزوں کا مسلمانوں پر اعتماد اُٹھ گیا، اور یہ بھی ایک سیاسی چال تھی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑانے کی کوشش کی۔ ہر پلٹن میں ایک مولوی (پیش امام) بھی ہوتا تھا جسے سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ایک افسر اور جوان ٹریننگ ختم کر کے حلف اُٹھاتا تھا کہ میں ہر حکم مانوں گا اور مجھے دُنیا کے کسی بھی حصّے میں جس کسی کے خلاف لڑایا جائے گا، لڑوں گا وغیرہ .... ہمارے مولوی صاحبان نے ہمیں یہ حلف و فاداری یاد دلایا اور وعظ کئے کہ تُرکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کرنا جُرم اور گناہ ہے

افسوسناک امر یہ ہے کہ ان مولویوں نے اپنے مسلمان سپاہیوں کو درپردہ بھی کبھی یہ نہ بتایا کہ تُرک جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ جہاد ہے اور ہم جہاد کے خلاف لڑ کر کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں مگر مولویوں کو انگریز کی خوشنودی زیادہ عزیز تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitani

میں حیدر کو میرٹھ کالج کی ہاکی ٹیم کے کھلاڑی کی حیثیت سے جانتا تھا مگر اُس کی یہ ڈرامائی اور پُراسرار گرفتاری میرے لئے معمّہ بن گئی اور اس کے ساتھ نادر خان، نادر شاہ اور زرّیں گُل بھی میرے لئے معمّہ بن گئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ اچانک سامنے آئے اور غائب ہو گئے۔ مجھے اس ڈرامے میں صرف اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ میں حیدر کو پہچانتا تھا اور میرے جسم جُثّے میں اتنی طاقت تھی کہ ایسے میں چارہ حیدر شکنجے میں جکڑ سکتا تھا۔

آیئے، مَیں آپ کو پھر میرٹھ چھاؤنی لے چلوں۔ نادر خان، نادر شاہ اور زرّیں گُل غائب ہو گئے تو چند دن بعد باغ علی نام کے ایک نوجوان کو ہمارے رسالے میں بھرتی کیا گیا۔ اس کے متعلق مجھے یہ پتہ چل گیا کہ وہ اُس نادر خان کا بیٹا ہے جس نے دروازے پر دستک دے کر دروازہ کھلوایا اور میرے ہاتھوں حیدر کو پکڑوایا تھا۔ باغ علی چُست و چالاک، سوجھ بوجھ والا اور تیز طرّار نوجوان تھا۔ ہاکی کھیلتا تھا۔ محنت کر کے وہ رسالے کی ٹیم کا گول کیپر بن گیا اور بہت اچھا گول کیپر ثابت ہُوا اور سوار بھی اچھا نکلا، مگر رسالے کے جوان اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ اس کے باپ نادر خان کو ہتھکڑی لگا کر لے جایا گیا تھا پھر اس کے بیٹے کو دوسرے رنگروٹوں کے مقابلے میں غیر ضروری مراعات کیوں دی جا رہی ہیں۔ مثلاً باغ علی کو آفیسرز مَیس کا کلرک بنا دیا گیا اور اسے وہاں رہنے کے لئے الگ کمرہ دے دیا گیا۔ حالانکہ میں بھی مَیس کی کلرکی کر چکا تھا لیکن مجھے الگ کمرہ نہیں دیا گیا تھا۔ کمرے کے علاوہ باغ علی کو مَیس سے مُفت اور نہایت اچھا کھانا ملتا تھا۔

ہمارا رسالہ عراق کے محاذ پر گیا تو باغ علی بھی ساتھ تھا۔ اب تو اُس کے خلاف جوانوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی بھی اُس سے مُنہ نہیں لگاتا تھا۔ میرا رویّہ مختلف تھا اس لئے باغ علی اکثر میرے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے اُس سے اُس کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ واقعی نادر خان کا بیٹا ہے اور گوجر خان کا رہنے والا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کا باپ

نادر خان اور اُس کے دو ساتھی، نادر شاہ اور زرّیں گُل رسالے یا فوج کے ملازم نہیں بلکہ وہ بنگال سپیشل پولیس کے سراغرسانی کے شعبے کے بڑے ہی ہوشیار اور ذہین افراد ہیں۔ انہیں حیدر کی گرفتاری کے لئے میرٹھ لایا گیا تھا اور ان کی اصلی حیثیت کو چُھپانے کے لئے انہیں اس رسالے میں بھرتی کیا گیا تھا۔ زرّیں گُل کو دفعدار، نادر کو لانس دفعدار اور نادر شاہ کو بے اسپہ (بغیر گھوڑے کے) سپاہی بنایا گیا تھا۔ باغ علی نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ کلکتہ میں رہتا تھا۔ وہاں اُس نے آٹھ جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن وہ انگریزی اور بنگالی زبانیں روانی سے بولتا اور لکھتا تھا۔

مزید انکشافات کے مطابق نادر خان انگریزوں کا بڑا ہی ہوشیار سراغرساں اور جاسوس تھا۔ اُس نے بنگالی دہشت پسندوں کو گرفتار کرانے میں حیران کن رول ادا کیا تھا۔ اُس کا کمال یہ تھا کہ ایک بار دہشت پسند بن کر ایک گروہ کے ساتھ جا ملا۔ اُن کے ساتھ اُس نے دستی بم بھی بنائے اور پورے گروہ کو جال میں اُلجھا کر ایسے موقع پہ گرفتار کرایا جہاں سے وہ نکل نہیں سکتے تھے۔

بمبئی میں کوئی زمین دوز گروہ کرنسی نوٹ بناتا تھا اور یہ جعلی کرنسی اصلی کے روپ میں منڈی میں چل رہی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود اس گروہ کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ آخر نادر خان نے اس گروہ کو اس طرح گرفتار کرایا کہ اُس نے کہیں سے نوٹ بنانے کا فن سیکھا پھر اس گروہ کا سراغ لگایا۔ ان کے خفیہ اڈے تک پہنچا۔ کچھ عرصہ وہاں نوٹ تیار کئے اور ایک روز پورے کا پورا گروہ اس حالت میں پولیس کے چھاپے میں پکڑا گیا کہ نوٹ تیار ہو رہے تھے اور گروہ کے تمام افراد موجود تھے۔ تب انہیں پتہ چلا کہ نادر خان ان کا ساتھی نہیں بلکہ جاسوس ہے۔

نادر خان دراصل دہشت پسندوں کے لئے دہشت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے بہروپ میں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کی زندگی ہر لمحہ خطرے میں رہتی تھی۔ مَیں آگے چل کر بتاؤں گا کہ نادر شاہ اور زرّیں گُل کا بنگالی دہشت پسندوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے کیا حشر کیا تھا۔ حیدر کو پکڑنے کا سہرا ابھی نادر خان کے سر تھا۔ وہ دہشت پسند بن کر حیدر اور دو سکھوں کو دھوکے میں اس کمرے میں لے آیا تھا۔ اُس نے جس انداز سے دروازے پر دستک دی تھی وہ دہشت پسندوں کا مخصوص انداز اور خفیہ طریقہ تھا۔ ان دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کا مرکز غالباً ہمارا رسالہ تھا۔ ہمارے کئی سردار اور جوان پکڑے گئے اور انگریزوں نے انہیں کالے پانی یا پھانسی کے تختے پر بھیج دیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ باغ علی کو رسالے میں اتنی مراعات کیوں دی گئی ہیں۔ یہ دراصل انعام تھا جو انگریز اس کے باپ کے کارناموں کے صلے میں اسے دے رہے تھے۔ ہمارا رسالہ عراق کے محاذ پر جب ناصریہ پہنچا تو باغ علی لانس دفعدار بنا دیا گیا۔ یہ ترقی دے کر اسے مَیں سے ہٹا کر رسالے میں بھیج دیا گیا۔ اسے اتنی جلدی اتنی زیادہ ترقی دینے پر رسالے میں احتجاج بھی ہُوا لیکن انگریز افسروں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔

اب ذرا غور کیجئے کہ باپ اور بیٹے میں کتنا فرق تھا۔ باپ انگریزوں کا سراغرساں تھا جس نے دہشت پسندوں کے خلاف سراغرسانی کا محاذ قائم کر کے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی اور بیٹا باپ کے بالکل اُلٹ ثابت ہُوا۔ وہ اس طرح کہ ہمارا مقابلہ ترکوں سے تھا۔

ایک روز ہماری ایک گشتی پارٹی آگے گئی۔ اس کا کمانڈر دفعدار باغ علی تھا۔ اُس نے ایک مقام پر جا کر گھوڑے کا رُخ ترکوں کے مورچوں کی طرف کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا۔ آگے سے ترکوں نے اُس پر فائر کھول دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہمارے مورچوں سے بھی اُس پر فائر کیا گیا تاکہ وہ ترکوں تک زندہ نہ پہنچ سکے لیکن دونوں طرف کے فائر کی ایک بھی گولی اُسے نہ لگی اور وہ ترکوں سے جا ملا۔

باقی مسلمانوں نے تو ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا تھا لیکن باغ علی واحد مسلمان تھا جو ترکوں سے جا ملا اور اپنا گھوڑا اور ہتھیار بھی ساتھ ہی لے گیا۔ جنگِ ختم ہونے کے بعد باغ علی واپس آیا تھا مگر اُس کے خلاف

اس کے سوا اور کوئی کارروائی نہ کی گئی کہ اُسے رسالے سے نکال دیا گیا۔ غالباً یہ بھی ایک انعام تھا جو انگریزوں نے نادر خان کو دیا تھا کہ اس کے بیٹے کو بھگوڑا ہو کر دشمن سے جا ملنے کی سزا (سزائے موت) دینے کی بجائے اُسے جنگی قیدی کا درجہ دے دیا تھا۔

دہشت پسند تحریک کا پسِ منظر

پہلی جنگِ عظیم ختم ہو گئی۔ ہم ہندوستان میں آ گئے۔ ۱۹۲۸ء میں میرا رسالہ لاہور چھاؤنی میں آ گیا۔ لاہور میں میرے خالو خان بہادر عبدالعزیز سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای، او۔ بی۔ ای پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے۔ ایک شام وہ اپنی موٹر گاڑی میں مال روڈ پر جا رہے تھے۔ میاں میر نہر کے پُل پر گاڑی پہنچی تو کسی نے بم پھینکا۔ ڈرائیور اور گارڈ مارے گئے۔ خان بہادر عبدالعزیز دھماکے سے گاڑی میں سے اُڑے اور نہر میں جا پڑے اور بال بال بچ گئے۔

دو ہفتوں بعد خان بہادر دفتر سے اپنے بنگلے کو جا رہے تھے۔ موٹر گاڑی میں سوار تھے۔ آج جہاں گلبرگ ہے وہاں اُس زمانے میں آموں کے باغ، کھیت اور جنگل ہوتا تھا۔ گاڑی وہاں پہنچی تو اس پر چند آدمیوں نے گولیاں چلائیں اور دستی بم بھی پھینکا۔ خان بہادر کو بازو پر معمولی سا زخم آیا اور ڈرائیور شدید زخمی ہُوا۔ دہشت گردی کے یہ واقعات نئے اور حیران کن نہیں تھے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ یہ واقعات ہو رہے تھے۔ وائسرائے کی ریل گاڑی بم سے اُڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسمبلی ہال میں بم پھینکا گیا تھا۔

اس دہشت پسند تحریک کا پسِ منظر مختصراً یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو معاشی لحاظ سے ختم کر دیا۔ فوج میں ان کی بھرتی بند کر دی۔ ہر محکمے میں ملازمت کے دروازے بند کر دیتے۔ ریاستوں کی فوجیں انگریز افسروں کے ماتحت آ گئیں۔ مہاراجے اور نواب برائے نام حکمران

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

رہ گئے۔ نظام حیدر آباد دکن نے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لئے برار کا بہت ساوسیع و عریض زرخیز علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ مدراس اور بنگال انگریزوں کی طاقت کے مرکزی علاقے تھے۔ کلکتہ ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ ان علاقوں میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ وقف کی جائدادیں جن سے مسلمانوں کے مدرسے چلتے تھے، ضبط کر لی گئیں۔ بنگال میں اس جبر و تشدّد کے خلاف تیتومیر اور دھودُو میاں کی تحریکیں شروع کر دی گئیں۔ یہ دہشت پسند تحریکیں تھیں۔ ان کے ممبروں کے لئے داڑھی رکھنا لازمی تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں پر داڑھی رکھنے کی پابندی عائد کر دی۔ جو مسلمان داڑھی رکھتا اُسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

تمام سینئر مجسٹریٹ انگریز اور چھوٹے افسر ہندو تھے۔ بنگال میں دفتری حساب کتاب اُردو ہندسوں میں ہوتا تھا۔ اُردو کی جگہ انگریزی اور بنگالی زبانیں رائج کر دی گئیں۔ مسلمانوں کی دہشت پسند تحریکوں نے سنگین صورت اختیار کر لی تو لارڈ کرزن کو گورنر جنرل بنا کر کلکتہ بھیجا گیا۔ وہ مسلمانوں کے لئے کچھ مراعات لے کر برطانیہ سے آیا۔ ہندوؤں نے ان مراعات کے خلاف دہشت پسند تحریکیں شروع کر دیں۔ ان میں کانگرس بھی شامل تھی جس کا سرغنہ سبھاش چندر بوس تھا اور ایک تحریک کا نام "کاماگاٹامارو" تھا جس کی کمان راش بہاری گوش کے ہاتھ تھی۔ اسے وہ جنگِ آزادی کہتے تھے لیکن ہندوؤں کا اصل محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی (مسلم بنگال) اور مغربی بنگال۔ دارالحکومت کلکتہ کی بجائے دہلی منتقل کر دیا گیا۔

حکومتِ ہند کے ان فیصلوں کے خلاف ہندو تحریکوں نے شدّت اختیار کر لی۔ انگریزوں نے ان تحریکوں کو دبانے کے لئے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کو اور یو۔پی سے اُن پٹھانوں کو جو وہاں آباد تھے، ایک خصوصی پولیس فورس میں بھرتی کیا جس کا نام بنگال سپیشل پولیس تھا۔ انہی مسلمانوں

میں سے بہت سی نفری کو برما بھیج کر برما پولیس بنائی اور ہانگ کانگ بھیج کر ہانگ کانگ سپیشل پولیس بنائی۔ بنگال سپیشل پولیس کو خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میرے خالو، خان بہادر عبدالعزیز کو دہشت پسند گروہوں کی سراغرسانی اور سرکوبی کے لئے کلکتہ بھیجا گیا۔ نادر خان، نادر شاہ اور زرّیں گُل اسی پولیس فورس کے چُنے ہوئے سراغرساں اور نڈر کارندے تھے۔ انہیں خان بہادر عبدالعزیز کا معاون بنایا گیا۔

۱۹۱۱ء میں اس تحریک کے آدمیوں نے دہلی کے چاندنی چوک میں وائسرائے پر بم پھینکا۔ وائسرائے تو بچ گیا، اُس کے ساتھ جو سٹاف تھا اُس کا کوئی فرد زندہ نہ رہا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ بم راش بہاری گھوش اور پنگلی نام کے ایک بنگالی نے پھینکا تھا۔ وہ پکڑے نہ جا سکے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ دونوں گروہ کے سرغنے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں زندہ یا مردہ پکڑنے والے کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔ راش بہاری گھوش کے لئے پانچ لاکھ اور پنگلی کے لئے دو لاکھ روپیہ ——— یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے زیرِ زمین اڈے بنارس، لکھنؤ، میرٹھ، دہلی، ڈیرہ دُون، امرتسر اور لاہور میں ہیں۔

خان بہادر عبدالعزیز نے سراغرسانی شروع کر دی ——— نادر خان، نادر شاہ اور زرّیں گُل ان کے معاون تھے۔ خان بہادر عبدالعزیز نے بنارس میں سادھو کے بھروپ میں اپنا اڈہ قائم کر لیا۔ ان کے تینوں معاون مختلف بھروپ میں سارے ہندوستان میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ دہشت پسند بھی بڑے ذہین اور جاسوسی کے ماہر تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ بنارس میں بیٹھا ہوا یہ سادھو، سادھو نہیں۔ سپیشل پولیس کا ڈی۔آئی۔جی ہے۔ چنانچہ خان بہادر پر حملہ ہوا اور دہشت پسند انہیں اس حال میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک گئے کہ وہ بظاہر مر چکے تھے۔ ان کی قسمت اچھی تھی، بچ نکلے ——— دہشت پسندوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ لاہور میں بھی ان پر بم پھینکے گئے لیکن اللہ نے انہیں ہر بار بچا لیا۔

نادر خان، زرّیں گُل اور نادر شاہ مختلف چھاؤنیوں میں سراغرسانی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرتے رہے۔ اطلاع ملی تھی کہ دہشت پسندوں نے فوجی سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا ہے۔ میں یہ تفصیلات بتانے سے قاصر ہوں کہ نادر خان اور اس کے ساتھیوں نے میرٹھ چھاؤنی میں دہشت پسندوں کو جال میں کس طرح پھانسا تھا۔ سنی سنائی یہ ہے کہ نادر خان دہشت پسند بن کر ان سے مل گیا تھا اور حیدر کو دو سکھوں کے ساتھ رسالے کے سکھ سکواڈرن کے ایک کمرے میں میٹنگ کے بہانے لے آیا تھا۔

جب حیدر پکڑا گیا تو انکشاف ہوا کہ وہ بنگالی ہے جس کی گرفتاری کے لئے انگریزوں نے دو لاکھ روپیہ انعام مقرر کر رکھا تھا۔ وہ مسلمان کے بہروپ میں حیدر نام رکھ کر میرٹھ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کی دہشت گردی کے تارگیٹ میرٹھ، دہلی، لاہور اور امرتسر میں تھے۔ اس کی گرفتاری کے صلے میں نادر خان کو ایک لاکھ روپیہ، زریں گل کو ستر ہزار روپیہ اور نادر شاہ کو تیس ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔ اس کے علاوہ نادر خان کو جمعدار، زریں گل کو بھی جمعدار اور نادر شاہ کو دفعدار بنا کر فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانس میں انہیں برطانوی کمانڈر انچیف کی سیکورٹی فورس میں لگا دیا گیا۔

دہشت پسندوں نے انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ۱۹۲۹ء میں میرا رسالہ کوہاٹ گیا۔ ایک روز میں کوہاٹ سے پشاور جا رہا تھا۔ راستے میں پتوڈیری نام کا ایک گاؤں آیا تو مجھے زریں گل اور نادر شاہ یاد آ گئے۔ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ فرانس سے واپس آ گئے تھے۔ میں نے اس گاؤں سے ان دونوں کے متعلق پوچھا تو مجھے بتلایا گیا کہ وہ فرانس سے واپس آتے تو چھٹی پر آ گئے۔ دونوں کے گھروں میں کسی نے بم پھینکے اور دونوں مارے گئے۔

✪

باغ علی خان مرحوم کے خاندان کے ایک اہم فرد خان مشتاق خان ڈسٹرکٹ راولپنڈی نے باغ علی خان کے ترکوں سے جا ملنے کے ولولہ انگیز واقعہ میں یوں اضافہ کیا:

باغ علی خان ایک گشتی پارٹی کے کمانڈر تھے۔ جب یہ گشتی پارٹی ان کے

لیے بہت آگے نکل گئی تو اُس وقت باغ علی خان دائیں طرف تھے اور ان کے بائیں طرف ایک سکھ تھا۔ باغ علی خان کی نظر ویسے ہی بائیں طرف گئی تو انہیں بہت سے تُرک دکھائی دیئے جو ایک پہاڑی کے پیچھے توپیں لگاتے بیٹھے تھے۔ اُن دنوں تُرکوں کے خلاف مسلمانوں کا لڑنا قابلِ نفرت تصوّر کیا جاتا تھا۔

باغ علی خان کے دل میں جذبہ اسلام نے جوش مارا۔ انہوں نے سکھ سے کہا کہ وہ دائیں طرف آ جاتے۔ وہ خود بائیں طرف ہو گئے۔ یہ گشتی دستہ آگے نکل گیا۔ انگریزوں کی فوج کو ان کے متعلق خبر نہ ہو سکی۔ باغ علی خان نے اچانک گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رُخ تُرکوں کی طرف کر لیا اور تُرکوں سے جا ملے۔ تُرکوں کے توپخانے نے انگریزوں کے بریگیڈ پر گولہ باری کی اور ان کا بہت نقصان کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ تُرکوں نے باغ علی خان کی نشاندہی پر گولہ باری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نادر خان کی فرانسیسی بیوی سے سب سے بڑا لڑکا، جان نادر پاک فوج میں بریگیڈیئر ہیں۔ نادر خان کا دوسرا لڑکا ایوب نادر امریکہ میں شہرت یافتہ ڈاکٹر ہیں۔

۱۵-۱۹۱۴ء میں لاہور سازش کیس اور دہلی سازش کیس بہت مشہور ہوئے۔ ان میں پرینگل المعروف ولیپ سنگھ کا نام قابل ذکر ہے۔ جب بنگالی کو بم بناتے ہوئے اندر ہی انگریز آفیسر نے گرفتار کر لیا تو اُس وقت نادر خان اور زرین گل کو بھی ساتھ ہی گرفتار کر کے لے گئے اور تینوں کو جیل میں بند کر دیا پھر علیحدہ کر دیا گیا اور انگریزوں نے نادر خان اور زرین گل کو فرانس بھیج دیا کیونکہ ان کی جان کا سخت خطرہ تھا۔

بنگالی دہشت پسند نے آخری خواہش ظاہر کی کہ وہ اُس شخص کو دیکھنا چاہتا ہے جس نے اُسے گرفتار کرایا ہے۔ چنانچہ نادر خان کو پیش کیا گیا مگر اُس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ نادر خان وہی ہے جو اُس کے ساتھ مل کر بم بناتا تھا اور کہا کہ اُس کی تو بڑی بڑی مونچھیں تھیں، پشتو بولتا تھا۔ یہ کوئی انگریز ہے۔ جب نادر خان کو اُس کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس وقت نادر خان بالکل انگریز معلوم ہو رہے تھے۔ مونچھیں بالکل صفاچٹ تھیں۔ داڑھی بالکل صاف۔ یہ اُن میں ایک خاص کمال تھا کہ جب بھیس بدلتے تو اُن کو پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔